قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا تہتر واں سال

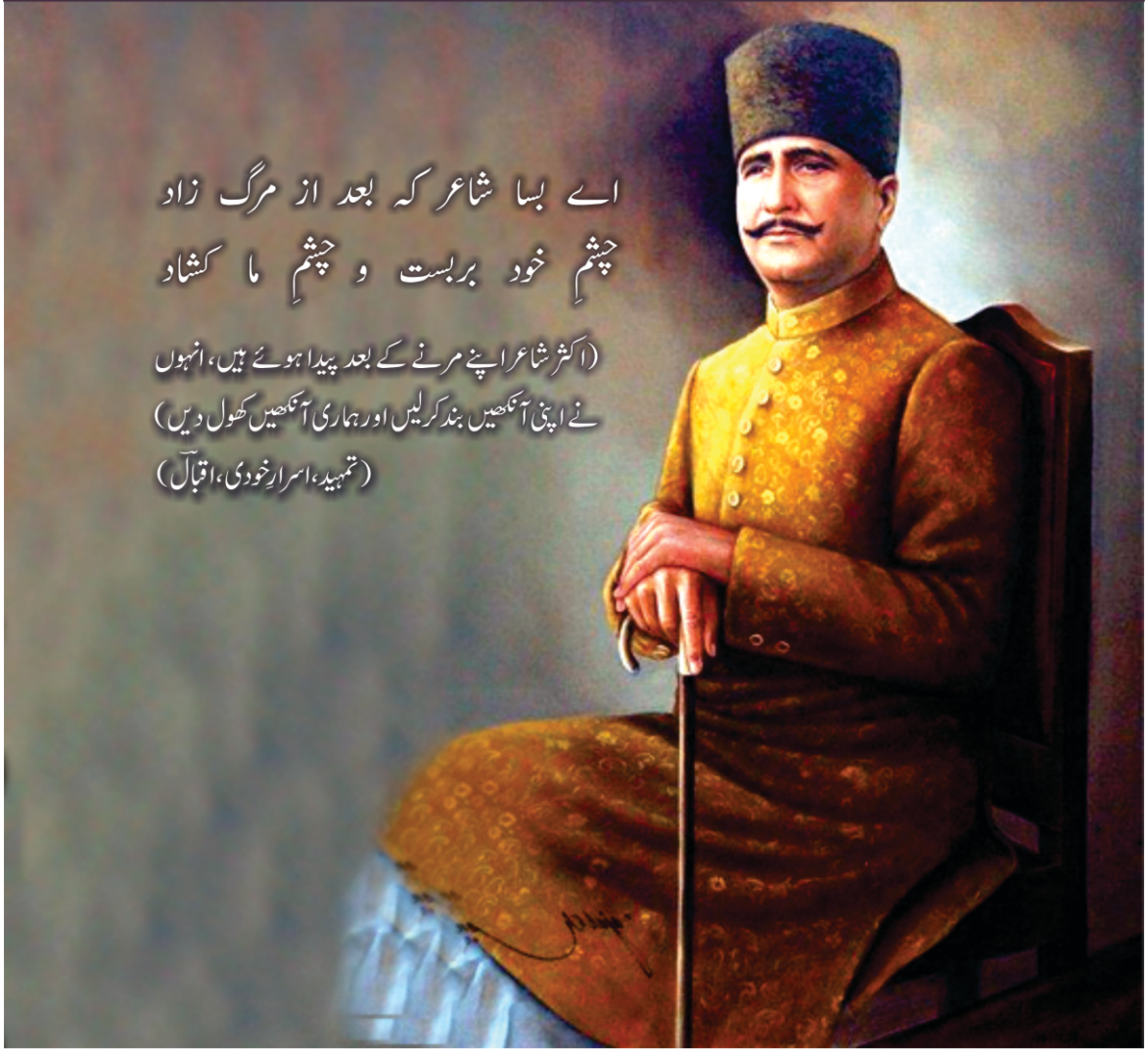
ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

نومبر 2016ء

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پرویز صاحب کے علمی اسلوبِ تحقیق کی تائید

قرآنی نظریات کی روشنی میں مغرب کے غلط تصورات کی تردید میں محترم پرویز اور ہمارے ہاں کے مفکرین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان میں سے ڈاکٹر علامہ اقبال، ڈاکٹر رفیع الدین احمد اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی تصنیفات سے چند اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔ جب بھی قارئین ان اقتباسات کی روشنی میں محترم پرویز صاحب کی تصنیفات کا جائزہ لیں گے تو وہ ان تمام خوبیوں کو بشمول دیگر خوبیوں کے ان میں پائیں گے۔ اس موضوع پر محترم پرویز صاحب کا موقف جاننے کے لئے خصوصی طور پر ان کی تصانیف ''انسان نے کیا سوچا'' اور ''اسلام کیا ہے'' ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہیں۔

(1) ڈاکٹر علامہ اقبالؒ کا موقف:

1- عقل اور وحی میں تصادم نہیں بلکہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

2- قرآن سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ:

(الف) اپنے زمانوں کے تقاضوں اور اپنے دور کی فکری کاوشوں سے متعارف ہوں۔

(ب) قرآن کریم کو عربی زبان اور تصریفِ آیات کی رو سے سمجھنا چاہئے اور اس پر خارجی عناصر کو اثر انداز نہیں ہونے دینا چاہئے۔

(2) ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا موقف:

مغرب کے غلط فلسفیانہ تصورات کی تردید قرآنی نظریات سے کرتے ہوئے مصنف کے لئے ضروری ہے کہ:

1- وہ روحِ قرآن کے ساتھ پوری پوری واقفیت پیدا کریں جس کے بغیر قرآنی اور غیر قرآنی تصورات میں تمیز کرنا مشکل ہوگا۔

2- وہ مغرب کے غلط تصورات کے اصل ماخذ اور ان کے متبعین کے طرزِ خیال و عمل سے پوری پوری واقفیت پیدا کریں۔

3- وہ علم کے تمام شعبوں سے یعنی مادی، حیاتیاتی اور نفسیاتی علوم اور فلسفہ سے جو ان علوم کو جمع کر کے ایک مکمل نظریہ کائنات ترتیب دیتا ہے، اس حد تک واقف ہوں کہ ان کی ساری وسعت میں جہاں کہیں کوئی اسلامی تصور موجود ہو اسے پہچان کر لے سکیں اور استخراج اور استنباط سے مزید صحیح اسلامی تصورات کو اخذ کر سکیں۔

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

جلد 69 | شمارہ نمبر 11 | نومبر 2016ء

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

ناشر و چیئرمین: محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق
خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

زرِ تعاون	50 روپے فی پرچہ
پاکستان	-/550 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک	-/800 روپے سالانہ
بیرون ملک	-/2500 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک	-/5000 روپے سالانہ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات	ادارہ	4
پرویزؔ صاحب کا نظریۂ اسلامی مملکت	ملک منظور حسین لیل	6
ثواب ہوتا کیا ہے؟	غلام احمد پرویزؔ	14
آدم اور فرشتوں کی کہانی	عارف محمود کسانہ	26
اسلامی نظام کی معاشی قدریں	خواجہ ازہر عباس	28
قرآنی تعلیمات کے مطابق مرد عورت سے افضل نہیں	ڈاکٹر انعام الحق	37

ENGLISH SECTION

Manzil ba Manzil (منزل بہ منزل) (Episode-1)

Chapter 4: Builder of Kaaba (*Mei'mar Haram* - معمارِ حرم)

To leaders of Spring's caravan

By G. A. Parwez (Translated by: M. Alam) 57

Idara Tolu-e-Islam Bank Account National Bank of Pakistan
Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465-22-003082-7

For International Transactions
IBAN: Pk21 NBPA 0465 0022 0003 0827
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ نمبر 2، لاہور۔ 54660، (پاکستان) فون: 042-35714546
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

ابھی تک آدمی صید زبونِ شہریاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے
نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغ کارزاری ہے
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے
عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی، جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے
خروش آموزِ بلبل ہو، گرہ غنچے کی وا کردے
کہ تو اس گلستاں کے واسطے بادِ بہاری ہے
پھر اٹھی ایشیا کے دل سے چنگاری محبت کی
زمیں جولاں گہِ اطلس قبایانِ تتاری ہے
بیا پیدا خریدارست جانِ ناتوانے را
''پس از مدت گذار افتاد بر ما کاروانے را''

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

نورِ قرآن اور اقبالؒ

اسلام صدیوں سے دین کے بجائے مذہب بن چکا ہے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ اُمت کو بتایا جائے کہ جس مذہب کی تم پیروی کر رہے ہو، وہ دینِ خداوندی نہیں۔ اسلام اسی صورت میں الدین کی شکل اختیار کر سکے گا جب اپنی ایک آزاد مملکت ہو اور اس میں قرآن کی حکمرانی ہو۔ ہمارا زمانہ اس اعتبار سے انتہائی خوش بخت ہے کہ اس میں ایک ایسا دیدہ ور پیدا ہوا جس نے اس فراموش کردہ حقیقت کو اُمّت کے سامنے پیش کیا۔ یہ تھے حکیم الامّت، علامہ اقبالؒ۔ انہوں نے اس قسم کا کوئی دعویٰ نہیں کیا کہ وہ مامور من اللہ ہیں، یا انہیں خدا کی طرف سے الہام ہوتا ہے۔ ایسا دعویٰ ختمِ نبوّت کے منافی اور یکسر باطل تھا۔ انہوں نے واضح الفاظ میں بتایا کہ قرآنِ کریم پر غور و تدبّر اور اسوۂ رسول اللہ ﷺ کے گہرے مطالعہ سے انہوں نے اس حقیقت کو سمجھا ہے جسے وہ اپنی بصیرت کے مطابق کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ آپ ان کے کلام کو شروع سے اخیر تک دیکھتے جایئے، اس میں روشن پر آپ کو عظمتِ قرآنی کے پھول کھلے دکھائی دیں گے۔ ان کا پیام، قرآنی حقائق ہی کی تشریح و توضیح ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ جب سابقہ انبیاء کرام علیہم السلام دین کو اس حقیقی شکل میں پیش کرتے تھے تو مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوتی تھی۔ علامہ اقبالؒ نے دینی مملکت کا تصوّر پیش کیا اور قائداعظمؒ نے اس تصوّر کی عملی تشکیل کے لیے تحریکِ پاکستان کا آغاز کیا۔ نیشنلسٹ علماء کی طرف سے اس تحریک کی مخالفت لازمی تھی کیونکہ ان کے پیشِ نظر تو اسلام کا وہی تصوّر تھا جس میں اعتقادات، عبادات، اور شخصی قوانین کی آزادی ہو اور پبلک لاز، مغرب کے جمہوری انداز سے وضع کئے جائیں۔ ان کا اسلام کے متعلق یہی تصوّر تھا جس پر، جامع انداز میں تنقید کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اسلام تو اسی صورت میں آزاد ہو سکتا ہے کہ جملہ قوانینِ مملکت، کتاب اللہ کی حدود کے اندر رہتے ہوئے متعین کئے جائیں اور یہ اپنی آزاد مملکت کے بغیر ممکن نہیں۔ اسلامی نظام کا یہ تصوّر، اُمّت کی نگاہوں سے صدیوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

منزل و مقصودِ قرآں دیگر است
رسم و آئینِ مسلماں دیگر است

قرآن کا نصب العین، اس کی منزل، اس کا منتہیٰ، اس کا مقصود کچھ اور ہے اور مسلمانوں کا اسلام کا تصوّر، ان کے رسوم و مناسک، ان کا شعارِ زندگی، ان کا آئینِ حیات کچھ اور، یہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں ؎

بندۂ مومن ز قرآں بر نخورد
در ایاغِ او نہ مے دیدم، نہ دُرد

اصل یہ ہے کہ اُمّتِ مسلمہ نے قرآنِ کریم کے نخلِ حیات کا پھل کھایا ہی نہیں۔ یہ وجہ ہے کہ اس کے ساغرِ زندگی میں، قرآن کی شرابِ طہور تو ایک طرف، اس کا تہ جرعہ تک بھی دکھائی نہیں دیتا۔ کیا یہ حقیقت انتہائی تعجب انگیز اور حیرت افروز نہیں کہ ؎

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست
خود سرِ تختِ ملوکیت نشست

وہ قوم جس نے قیصر و کسریٰ کی ملوکیت کو نیست و نابود کر دیا، اس کے بعد، وہ خود تختِ ملوکیت بچھا کر اس پر مسند نشین ہو گئی اور پھر ؎

تا نہالِ سلطنت قوت گرفت
دین او نقش از ملوکیت گرفت

جب نظامِ ملوکیت محکم ہو گیا تو دین، تمام تر اسی کے رنگ میں رنگا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ؎

آفریدی شرع و آئینے دگر

اسلام کی جگہ ایک مذہب، ایک نئی شریعت وجود میں آ گئے۔ اب اس کا علاج یہ ہے کہ ؎

اند کے با نورِ قرآں در نگر

اپنے آئینِ حیات کا جائزہ قرآن کی روشنی میں لو۔

یہی تھا وہ ''نورِ قرآن'' جس کی روشنی میں علامہ اقبالؒ نے اسلامی مملکت کے بنیادی تصوّرات نہایت واضح الفاظ میں پیش کئے۔

(ماخوذ طلوعِ اسلام نومبر 1985ء)

ملک منظور حسین لیلیٰ۔ بھکر
0332-7636560
mhleeladv@yahoo.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قسط نمبر 13

پرویز صاحب کا نظریۂ اسلامی مملکت

(قرآنی حکومت)

اور جو لوگ ما انزل اللہ (قرآن) کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، وہی لوگ کافر، ظالم، فاسق ہیں (5:44-45-47)

نظامِ معیشت

نظریۂ اُجرت:

طلوع، اسلام مئی 1985ء، ص: 2 تا 7: ''(مزدور کے) اس مسئلہ (اجرت) کے حل نے دنیا کو دو بڑے متصادم بلاکوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ دونوں فریقوں کا دعویٰ حق پر ہونے کا ہے۔ دونوں انسانیت کی فلاح و بہبود کے علمبردار بنے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے تباہ کن اسلحہ تیار کرنے کی لامتناہی دوڑ میں مصروف جبکہ انسانیت ان کے اس تصادم کے درمیان پس رہی ہے، کراہ رہی ہے۔ اس کے باوجود دعویٰ یہی ہے کہ انسانیت کی فلاح اور امن کے لئے وہ، یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ قرآن کے الفاظ میں:- وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ۝ (2:11-12)۔ ''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد مت برپا کرو تو وہ کہتے ہیں (ہم کب فساد برپا کرتے ہیں) ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ خبردار رہو! یہی لوگ فسادی ہیں۔ لیکن انہیں اس کا شعور نہیں ہے۔'' اس آیت کریمہ سے یہ بات بھی ظاہر ہے کہ ایسے لوگ اپنے فساد انگیز عمل میں لاشعوری طور پر مصروف ہوتے ہیں۔ لیکن غلط اور درست کا کوئی خارجی معیار ان کے سامنے نہیں ہوتا اس لئے وہ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ ان کا وہی عمل درحقیقت فساد کی جڑ ہے، جسے وہ بزعمِ خود اصلاح کی خاطر سرانجام دینے میں مصروف ہیں۔

یومِ مزدور:

ہاں تو! یومِ مئی مزدوروں کا عالمی دن ہے۔ لفظ مزدور دراصل مرکب ہے ''مزد'' اور ''ور'' سے۔ جس کے معنی ہیں اجرت پانے والا۔۔ ایک آجر (اجرت دینے ولا) کا، اجرت پر کام کرنے والے کو مزدور کہنا تو سمجھ میں آتا ہے۔ حیرت تو اس پر ہے کہ خود مزدور بھی ''مزد۔ور'' رہنے پر قانع ہے۔۔ اور یہی صورت حال اس کے نام نہاد انقلابی لیڈروں کی ہے۔ مزدوروں اور ان کے لیڈروں کو اس بات کا احساس تک نہیں کہ ایسا سمجھنے سے وہ خود کو کس مقام پر لے آتے ہیں۔۔۔ نظامِ سرمایہ داری کا

مدار اجرت کے نظریہ پر ہے۔اس نظام میں ایک فریق سرمایہ لگاتا ہے،ضروری سامان اور مشینری مہیا کرتا ہے اور دوسرا فریق اپنی محنت فروخت کرتا ہے۔اور سرمایہ کار کے مقصد کے حصول کے لئے محنت کرتا ہے۔جبکہ سرمایہ کار اسے اس کی محنت کا معاوضہ ادا کرتا ہے۔کام کرنے والے کی محنت کا معاوضہ کتنا ہونا چاہیئے؟۔اس کا تعین خود محنت کش نہیں بلکہ سرمایہ دار کرتا ہے۔لیکن اس کے لئے کوئی پیمانہ،کوئی معیار مقرر نہیں۔معاوضہ چونکہ کام کا ادا کیا جاتا ہے اس لئے ہونا تو یہ چاہئے کہ معاوضہ کا تعین،کام کی مقدار اور نوعیت کے پیشِ نظر کیا جائے،لیکن اصلاً ایسا ہوتا نہیں ہے۔کیونکہ کاموں کے تنوع اور معیار کے فقدان سے ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔۔۔مزدور کی اجرت،معاشیات کے معروف اصول،طلب اور رسد، کے مطابق متعین کی جاتی ہے۔جسے اگر الفاظ کی جادوگری سے ہٹ کر حقیقت پسندانہ زاویہ سے دیکھا جائے تو وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک مجبور کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اس کا کس قدر زیادہ سے زیادہ استحصال کیا جاسکتا ہے؟۔

مجبوری سے فائدہ اٹھانا:

کسی شخص کی مجبوری جس قدر زیادہ ہوگی،اور ایسے اشخاص کی تعداد جس قدر زیادہ ہوگی،اسی قدر استحصال زیادہ کیا جا سکے گا،یعنی انہیں اجرت کم دی جائے گی۔یہی وجہ ہے کہ جوں جوں بیکاروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے اجرت کم سے کم تر ہوتی چلی جاتی ہے۔بالفاظِ دیگر بیکار مزدوروں کی تعداد اگر زیادہ ہو تو وہ کام حاصل کرنے کی خاطر کم اجرت پر کام کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔لیکن زیادہ اجرت حاصل کرنے کی خواہش ان کے ذہن سے محو نہیں ہوتی۔۔چونکہ کام کے مطابق اجرت ماپنے کا کوئی پیمانہ موجود نہیں لہٰذا،اجرت کے کم یا زیادہ ہونے کا حتمی فیصلہ کرنا ممکن نہیں۔مزدور کی خواہش اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ اجرت ملے اور آجر کی کوشش یہ کہ اسے کم از کم اجرت دی جائے۔اجرت کے پیمانہ کے فقدان کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ مزدور کو کچھ بھی دے دیا جائے وہ اسے ناکافی محسوس کرتا ہے۔جبکہ آجر سمجھتا ہے کہ اس کو ضرورت سے زیادہ زیر بار ہونا پڑ رہا ہے۔یہ ہے آجر اور مزدور کے درمیان تصادم کی بنیادی وجہ!۔۔۔دنیا میں ہر چیز کے ناپ تول کے پیمانے مقرر ہیں جن کی رو سے یہ فیصلہ کرنا آسان ہوتا ہے کہ کسی کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے یا نہیں۔لیکن جب کوئی پیمانہ یا معیار ہی موجود نہ ہو تو اجرت کے متعلق فیصلہ کیونکر کیا جاسکتا ہے کہ وہ انصاف پر مبنی ہے یا ظلم پر؟۔۔۔یہ صورتِ احوال نظامِ سرمایہ داری کے ہاں تھی اور اب تک ہے۔

سوشلزم:

آجر اور مزدور کے درمیان روز روز کے تصادم سے تنگ آکر اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے ایک اور نظامِ معیشت کی طرح ڈالی گئی جسے اشتراکیت یا سوشلزم کہا جاتا ہے۔لیکن یہ مسئلہ پھر بھی حل نہیں ہوا۔وجہ اس کی وہی ہے یعنی اشتراکی ممالک میں بھی مزدور۔''مُزدَور''۔ہی ہے۔وہاں بھی اسے اجرت ہی ملتی ہے کیونکہ سوشلزم کا فارمولا یوں بیان کیا جاتا ہے:۔''ہر شخص سے اس کی استعداد کے مطابق کام لیا جائے اور اس کے کام کے مطابق اسے معاوضہ دیا جائے''۔۔۔سوشلسٹ نظام میں

اگر فرق پڑا ہے تو صرف اتنا کہ نظامِ سرمایہ داری میں اجرت مقرر کرنے کا جو کام کوئی فرد (آجر) یا افراد کی تنظیم (فرم) کرتی تھی، سوشلسٹ نظام میں وہ کام حکومت کرتی ہے۔ کیونکہ ذرائع پیداوار کو وہ اپنی تحویل میں لے چکی ہوتی ہے۔ اگر بغور دیکھا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ یہ صرف آجر کے نام کی تبدیلی ہے جس سے مزدور کا مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔ بلکہ ایک لحاظ سے حالات بدتر ہوجاتے ہیں۔ نظامِ سرمایہ داری میں مزدور ایک آجر سے کام چھوڑ کر دوسرے آجر کے پاس بہتر شرائطِ ملازمت پر کام حاصل کرسکتا ہے۔۔ جب کہ سوشلسٹ نظام میں مزدور جہاں چاہے کام کرے، اسے ایک ہی آجر (حکومت) سے واسطہ پڑے گا۔۔ ذرائع رزق پر سوشلسٹ حکومت کی یہ اجارہ داری، مزدور کو کس طرح حیوانی سطح پر لے آتی ہے اور اسے کس قدر کم اجرت پر کام کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے، اس کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ اس بحث سے آپ یقیناً اس نتیجہ پر بھی پہنچ چکے ہوں گے کہ مزدور کا استحصال دونوں نظاموں میں ہوتا ہے۔ نظامِ سرمایہ داری میں بھی اور سوشلسٹ نظام میں بھی، بلکہ سوشلسٹ نظام میں کچھ زیادہ ہی۔۔۔ لہٰذا، یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ مزدوروں کا مسئلہ حل کرنے میں یہ دونوں نظام ناکام رہے ہیں۔ اور ان میں سے کوئی نظام بھی ایسا نہیں جو مزدوروں کا استحصال نہ کرتا ہو۔ اقتدار اگر اشتراکیت کے علمبرداروں کے ہاتھ میں آجائے تو بھی مزدور کی حالت بہتر نہیں ہوگی کیونکہ اجرت کے تعین کا مسئلہ پھر بھی جوں کا توں باقی رہے گا اور اجرت مقرر کرنے کے کسی خارجی معیار کے فقدان کے باعث یہ کشمکش جاری رہے گی۔ اس کا صرف ایک حل ہے اور وہ یہ کہ:۔

صلاحیت اور ضرورت:

''اجرت پر کام کرنے کا تصور مٹا دیا جائے''۔ اور ایسا صرف قرآن کی رو سے ہوسکتا ہے۔۔ قرآنی نظام میں سرمایہ کار اور محنت کش یا آجر اور مزدور کا امتیاز باقی نہیں رہتا، لہٰذا، اجرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس نظام میں اصولِ ربوبیت وہ ہے جسے حضور ﷺ نے بالتصریح بیان کردیا تھا کہ:۔ ''لوگو! تمام دولت اللہ کی ہے اور میں اس کا قاسم ہوں تم تمام اللہ کے بندے ہو اور تمہارے اعمال کا نگران ومحاسب بھی خدائے قدوس ہے۔ اسی کے احکام کو مدِ نظر رکھو۔ اسے سمیع وبصیر سمجھو۔ اور کام کرتے رہو۔ مقدور بھر محنت کرو اور میں تمہیں اتنا دوں گا جتنی تمہاری ضرورت ہوگی'' (بیہقی۔ مسند کبیر، الاوسط، مستدرک، الوسیط، العرجون القدیم)، بالفاظِ دیگر، قرآن کا اصولِ ربوبیت یہ ہے کہ:۔

ارشادِ رسول کریم ﷺ:

''کام صلاحیت کے مطابق۔ دام ضرورت کے مطابق''۔۔ یاد رکھئے! یہ مقولہ لینن کا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر ﷺ کا ارشاد ہے۔ اسی لئے تو لوئیس مارگن کو کہنا پڑا تھا کہ:۔ ''کام اہلیت کے مطابق، دام ضرورت کے مطابق''، یہ اصول مارکس اور لینن کا ایجاد کردہ نہیں۔۔ اصل میں یہ بات پیغمبرِ صحرا ﷺ نے کہی تھی۔ ان ﷺ کا یہ قول مجھے الوسیط میں لکھا ہوا ملا ہے کہ:۔ ''لوگو تمام دولت اللہ کی ہے اور میں اس کا تقسیم کرنے والا ہوں۔ تم تمام اللہ کے بندے ہو اور تمہارے اعمال کا نگران ومحاسب بھی وہی ہے۔۔ اسی کے احکام کو مدِ نظر رکھو، اسے سمیع وبصیر سمجھو۔ اور کام کرتے رہو۔ نکمے اور نکھٹو نہ بنو۔۔

مقدور بھر محنت کرو اور میں تمہیں اتنا دوں گا جتنی تمہاری ضرورت ہوگی‘‘۔۔مارکس اور لینن نے بھی یہی کہا تھا مگر ان سے خدا کا تصور چھین لینے کی جو غلطی سرزد ہوئی اسی نے سوشلزم کو سرمایہ داری کا حصہ بنا دیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ مارکس اور لینن کے دعوے چار دن میں ختم ہو گئے۔مگر پیغمبر صحرا ﷺ کا قائم کردہ نظام ریگزارِ عرب میں مدتوں مثالی معاشرہ کی تابانیوں میں جلوہ گر رہا۔‘‘(Haves and Have Nots by Lewis Morgan--p/41)۔۔قرآنی نظامِ حکومت میں ہر فردِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی کا مہیا کرنا نظامِ حکومت کے ذمہ ہوتا ہے(17:31،6:151)۔۔اور افرادِ معاشرہ تقسیمِ عمل کے اصول کے مطابق، اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق مختلف کام اپنا فرض سمجھ کر سرانجام دیتے ہیں۔۔۔۔اس نظام میں آجر تو ایک طرف کسی ایسے شخص (سپروائزر) کا تصور بھی موجود نہیں جو خود کوئی کام نہ کرے، بس دوسروں سے کام لینے کے لئے ان کی نگرانی کرے۔کیونکہ قرآنی نظام کے افراد جس اللہ پر ایمان لا کر اس نظام کے رکن بنتے ہیں اس اللہ تعالیٰ کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ ہر جگہ ہر شخص کے ساتھ موجود ہوتا ہے اور انہیں کام کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوتا ہے(57:4اور 58:7)لہٰذا، اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے والے افراد، انسانی نگرانی کے بغیر اپنے ذمہ کے کام کو فرض سمجھ کر پوری محنت اور دیانت داری سے سرانجام دیتے ہیں۔

تذلیلِ انسانیت:

ہم نے کہا تھا کہ مزدور اپنی محنت فروخت کر کے سرمایہ دار کے مقاصد کے حصول کے لئے کام کرتا ہے۔اس طرح محنت کش انسان کس قدر حیوانی سطح پر آجاتا ہے اور یہ کیونکر تذلیلِ انسانیت ہے، اسے ایک مثال سے سمجھئے۔۔تانگہ بان اپنے تانگہ میں اپنے گھوڑے کو جوتتا ہے اور پھر اسے سارا دن یہاں سے وہاں، اِدھر سے اُدھر جگہ جگہ لئے پھرتا ہے۔اس ساری بھاگ دوڑ میں گھوڑے کا اپنا مقصد کوئی نہیں ہوتا۔بلکہ وہ محض خوراک کے عوض دوسروں کا آلہء کار بنتا ہے۔۔کیا یہی کچھ مزدور کے ساتھ نہیں ہوتا؟۔کیا یہ اس کی بحیثیت ایک انسان کے تذلیل نہیں؟۔۔۔قرآنی نظام میں (منجملہ دیگر ارکانِ ایمان کے) ایک اللہ تعالیٰ پر ایمان لا کر تمام افرادِ معاشرہ بھائی بھائی قرار پاتے ہیں(49:10)۔یوں قرآنی معاشرہ ایک وسیع تر خاندان ہوتا ہے جس میں کوئی آجر و مزدور، کوئی حاکم و محکوم، کوئی ادنیٰ و اعلیٰ نہیں ہوتا۔

کس درایں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا ،حاکم و محکوم نیست

ہر شخص اپنی اپنی ڈیوٹی سرانجام دیتا ہے۔براہِ راست اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں ہونے پر ایمان، عمل میں کوتاہی و خیانت نہیں ہونے دیتا۔تکریمِ انسانیت ویسے بھی اس معاشرہ کی ایک اہم ترین قدر ہے(17:70)۔لہٰذا، اس معاشرہ کے کسی فرد سے کسی ایسی حرکت کے ارتکاب کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا جس سے کسی شخص کی توہین یا تذلیل کا پہلو نکلتا ہو۔

ذات کی پرورش:

قرآنی تفاصیل کے مطابق ایک اللہ تعالیٰ پر ایمان کے ساتھ ساتھ قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان وہ محکم بنیاد ہے جس پر قرآنی نظام استوار ہوتا ہے۔ قرآنی معاشرہ کے افراد خوب جانتے ہیں کہ جو کچھ ہم خود استعمال کرتے ہیں (خوراک، لباس وغیرہ) اس سے ہمارے جسم کی پرورش وحفاظت ہوتی ہے اور جو کچھ ہم دوسروں کی فلاح و بہبود کے لئے دیتے ہیں اس سے ہماری ذات کی پرورش ہوتی ہے (92:18)۔ جسم نے ایک دن موت سے ہمکنار ہوجانا ہے جبکہ ذات نے باقی رہنا ہے۔ لہٰذا، وہ صرف بقدرِ ضرورت رکھ کر اپنی زائد از ضرورت آمدن کو دوسرے ضرورت مندوں کی نشوونما اور فلاح و بہبود کے لئے دے دیتے ہیں (2:219)۔ وہ یہ سب کچھ ہنگامی طور پر نہیں کرتے، بلکہ اس معاہدہ کے مطابق کرتے ہیں جو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے نمائندے رسول ﷺ (یا خلیفۃ الرسول ﷺ) کے ذریعے (48:10) خود اللہ تعالیٰ سے کر رکھا ہوتا ہے (9:111)۔ یہی وجہ ہے کہ وہ یہ سب کچھ صلہ وستائش سے بالاتر ہوکر کرتے ہیں (9-76:8)۔ اور جب کبھی ایسا ہو کہ ان کے پاس ضرورت سے زائد ہو ہی نہیں بلکہ بمشکل اپنی ضرورت پوری کرنے کا سامان ہو اور ایسے میں کوئی اور ضرورت مند مل جائے تو قانوناً اس کی مدد کرنے کا پابند نہ ہونے کے باوجود وہ اس کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتے اور اس کی مدد کرتے ہیں (59:9)۔ یہ وہ جذبہء ایثار ہے جو صرف ایمان کی بدولت پیدا ہوتا ہے اور جس کے بغیر اتنا عظیم نظام چل ہی نہیں سکتا۔ اقبال نے جب روس کو مخاطب کر کے کہا تھا ؎

اے کہ می خواہی نظامے عالمے
جستۂ او را اساسِ محکمے؟

تو اس کا اشارہ قرآن حکیم کے پیش کردہ انہی ارکانِ ایمان کی طرف تھا۔ یہ ہے وہ نظام جس میں اجرت کا تصور مٹ جاتا ہے۔ اور محنت کش، حیوانوں کی طرح کسی سرمایہ دار کا آلہء کار بننے کی بجائے ایک با اختیار، باعزت، انسان کی حیثیت سے تقسیمِ عمل کے مطابق اپنے حصہ کا کام بطور فرض سرانجام دیتا ہے۔ اسے اپنی اور اپنی اولاد کی ضروریاتِ زندگی کی فکر لاحق نہیں ہوتی کہ یہ ذمہ داری اس نظام نے اپنے سر لے رکھی ہوتی ہے (119-20:118، 6:151، 17:31) جو اس وسیع تر خاندان نے قائم کر رکھا ہوتا ہے جس کا یہ خود ایک فرد ہوتا ہے۔ اس نظام میں معاشی اطمینان کے علاوہ انسان اس حقیقی آزادی سے بہرہ ور ہوتا ہے جس کا کہیں اور وجود تو ایک طرف، تصور تک نہیں پایا جاتا۔ یہ نظام قانون کی حکمرانی کا علمبردار ہوتا ہے۔ قانون کسی انسان کا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا نافذ ہوتا ہے کہ ؎

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے — حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری (12:40)

اس نظام میں کوئی شخص قانون سے بالاتر نہیں ہوتا (10:15,6:15) ہر شخص سے انصاف کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ دشمن

سے بھی (5:8)۔ بھلا ایسے نظام میں کسی محنت کش فردِ معاشرہ کے ساتھ کسی ظلم و زیادتی کا تصور تک بھی کیا جا سکتا ہے؟۔۔۔ سرمایہ ومحنت کی چپقلش کا حل نہ امریکہ اور یورپ کے سرمایہ دارانہ نظام کے پاس ہے نہ روس اور چین کے سوشلسٹ نظام کے پاس۔ کیونکہ دونوں نظاموں میں کام کی اجرت کا تصور موجود ہے اور یہی تصور سارے فساد کی جڑ ہے۔ محنت کشوں کے مسئلہ کا واحد، حقیقی اور اطمینان بخش حل صرف قرآنی نظامِ حکومت میں مضمر ہے جو کفالت و ربوبیتِ عمومی کا ذمہ دار ہے۔ یہ انقلاب ہو تو بڑا انقلاب ہو!۔''

محنت کا معاوضہ:

(ایضاً، ص: ۲۴)، ''قرآن کریم کی رو سے سب سے اہم سوال محنت کش کی محنت کے معاوضہ کا ہے۔ اگر اس کو پورا پورا معاوضہ نہ دیا جائے تو جو کچھ اس میں سے غصب کر لیا جائے، وہ حلال نہیں ہوگا، حرام ہو جائے گا۔ اس نے صاحبِ ضربِ کلیم حضرت موسیٰ اور فرعون کی آویزش کے سلسلہ میں کہا ہے کہ فرعون دوسروں کی محنت کو غصب کر لیتا تھا۔ اس لئے حضرت موسیٰ سے کہا گیا کہ اس کے مستبد اور ظالم نظام کو الٹ کر اس کی جگہ نظامِ خداوندی قائم کریں۔ :لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى۝ (20:15)۔ ''تا کہ ہر ایک کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ مل سکے۔'' فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا۝ (20:112)۔ ''اور کسی کو اس کا خطرہ نہ رہے کہ اس کے ساتھ ظلم و زیادتی ہوگی۔۔۔ اور اس کی محنت کے معاوضہ کو ہضم کر لیا جائے گا۔''۔ نظامِ سرمایہ داری میں یہ ناممکن ہے کہ محنت کش (مستاجر) کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ دیا جا سکے۔ اس میں محنت کشوں کو اجرت (wages) پر ملازم رکھا جاتا ہے، مستاجر (مزدور) اپنی اجرت مقرر نہیں کرتا۔ اسے آجر (ملازم رکھنے والا) مقرر کرتا ہے۔۔ اس معاملہ کو یہ کہہ کر برحق قرار دے دیا جاتا ہے کہ مزدور اپنی رضامندی سے اجرت منظور کرتا ہے۔ اس لئے اس پر کوئی ظلم اور زیادتی نہیں ہوتی۔۔ لیکن یہ وہی دلیل ہے جسے ہم تجارت کے باب میں دیکھ چکے ہیں کہ ''خریدار اپنی رضامندی سے قیمت ادا کرتا ہے''۔ واقعہ یہ ہے کہ خریدار ہو یا مزدور، دونوں اپنی مجبوری کی وجہ سے دوسرے کی بات مان لیتے ہیں۔ جس مزدور کے گھر میں کھانے کو ہو وہ کبھی آجر کی نامناسب شرائط پر کام کرنے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ اس کی معاشی مجبوریاں ہوتی ہیں جو وہ ہر شرط پر کام کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔۔ پنجابی زبان کا ایک محاورہ ہے کہ ''بھاء کن وگاڑیا۔ رات دیاں بھکیاں۔'' (رات کو بھوکے سونے والے نرخ بگاڑ دیتے ہیں)۔ قرآن کے معاشی نظام میں اجرتوں کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ مملکت تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کی ذمہ داری اپنے اوپر لیتی ہے۔ لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب (اور جہاں) قرآنی نظام رائج ہو۔ سوال یہ ہے کہ موجودہ حالات میں کیا کیا جائے۔ اس کا جواب یہی ہے کہ مملکت ایسا طریق وضع کرے جس سے محنت کش کی محنت غصب نہ کی جا سکے۔ ہم تو آجر سے اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ مستاجر (مزدور) کی محنت سے جو کچھ غصب کیا جائے، وہ رزقِ حلال نہیں رہتا۔

کام چور:

قرآن کریم جہاں آجر کو اس کی تاکید کرتا ہے کہ وہ مستاجر کی محنت کو غصب نہ کرے، وہاں وہ مستاجر (مزدور) سے بھی کہتا ہے کہ وہ اپنی محنت کا معاوضہ لینے کا حقدار ہے۔ اگر محنت کئے بغیر معاوضہ کا مطالبہ کرتا ہے تو وہ کمائی بھی حلال نہیں ہو گی۔ لَيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (53:39) اس کا بنیادی اصول ہے۔ یعنی انسان صرف اپنی محنت کے معاوضہ کا حقدار ہے۔ ''کام چور'' کی کمائی، حلال کی کمائی نہیں کہلا سکتی۔ جو کچھ اوپر آجر اور مستاجر کے متعلق کہا گیا ہے اس کا اطلاق ملازمت پیشہ حضرات پر بھی یکساں ہوتا ہے۔ وہ بھی اجرت ہی پر کام کرتے ہیں جسے تنخواہ کہا جاتا ہے۔''

کمیونزم:

طلوعِ اسلام ستمبر 1973ء، ص: 14، ''کمیونزم ایک معاشی نظام ہی نہیں، ایک نظریہء زندگی ہے، جس کی رو سے، خدا، وحی، رسالت، آخرت، مستقل اقدار، سب سے انکار کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ نہ اس نظریہء زندگی کا ماننے والا مسلمان ہو سکتا ہے، نہ کوئی مسلمان اس نظریہ کو ماننے کے بعد مسلمان رہ سکتا ہے۔ یہ وجہ ہے جو طلوعِ اسلام میں متعدد بار لکھا جا چکا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے نہ کوئی کمیونسٹ مسلمان ہو سکتا ہے، نہ کوئی مسلمان، کمیونسٹ۔ لیکن اس باب میں ایک خاص احتیاط کی ضرورت ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ہمارے ہاں کے اکثر نوجوان محض انقلابی بننے کے چاؤ میں اپنے آپ کو کمیونسٹ یا سوشلسٹ کہنے لگ جاتے ہیں۔ حالانکہ انہیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کمیونزم یا سوشلزم کا فلسفہء زندگی کیا ہے۔ ایسے نوجوانوں کے کفر و اسلام کا فیصلہ کرنے سے پہلے اس امر کا بہ تیقن معلوم کر لینا ضروری ہوگا کہ ایمانیات کے متعلق ان کا عقیدہ کیا ہے۔ یونہی مولوی صاحبان کی طرح فتوے صادر نہیں کر دینا ہوگا۔'' اسی شمارے کے صفحہ نمبر 13 پر وہ وضاحت فرماتے ہیں: ''میں قرآن کے صرف معاشی نظام کو پیش نہیں کرتا، اسے بہ حیثیت ایک کلی ضابطۂ حیات کے پیش کرتا ہوں۔ جو انسانی زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہے۔ معاشی نظام اس کا صرف ایک گوشہ ہے۔ قرآنی نظام کو یا تو بالکلیہ تسلیم اور اختیار کرنا ہوتا ہے، یا بالکلیہ چھوڑ دینا۔ وہ اس کی اجازت نہیں دیتا کہ اس کے کسی ایک گوشے کو اختیار کر لیا جائے اور دوسرے گوشوں کو چھوڑ دیا جائے۔ جب اسے بہ حیثیت کلی نظام اختیار کیا جائے تو وہ انسانی سیرت و کردار کی حدود بندی کرتا ہے اور انہیں اقدارِ خداوندی کا پابند قرار دیتا ہے۔ ان حضرات پر یہ پابندیاں گراں گزرتی ہیں۔ اس کے برعکس، سوشلزم یا کمیونزم کسی غیر متبدل، ابدی ضابطہء اخلاق و اقدار کے قائل ہی نہیں۔ اس لئے وہ اپنے متبعین سے کسی قسم کی اخلاقی پابندی کا تقاضا ہی نہیں کرتے۔ یہ ہے وہ ''کھلی چھٹی'' جس کی وجہ سے یہ حضرات سوشلزم اور کمیونزم کو ترجیح دیتے ہیں۔ ورنہ جہاں تک خالص معاشی نظام کا تعلق ہے، قرآنی نظام، سوشلزم یا کمیونزم کے نظام سے بھی کہیں آگے جاتا ہے۔'' (قرآن کے معاشی نظام کو سمجھنے کے لئے پرویز صاحب کی کتاب ''نظامِ ربوبیت'' کا مطالعہ ضروری ہے)۔

(جاری ہے)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شرحِ جاوید نامہ شائع ہوگئی!

مفکرِ قرآن غلام احمد پرویز علیہ الرحمتہ کے لیکچرز کی تحریر پر مشتمل اپنے انداز کی منفرد شرح جاوید نامہ شائع ہوگئی ہے۔ بڑے سائز کے 800 صفحات پر مشتمل اِس یکتائے روزگار شرح کی قیمت صرف ایک ہزار روپے ہے۔ ''جاوید نامہ'' کیا ہے اس کے متعلق پرویز علیہ الرحمتہ کی زبانی خود ملاحظہ فرمایئے:۔

''علامہ اقبالؒ کی فارسی کی کتاب ہے ''جاوید نامہ''۔ اگر آپ نوجوانوں کو اسلام کی تعلیم دینا چاہتے ہیں تو میں یہ عرض کروں گا' مبالغے کی بات نہیں ہے' یہ ایک کتاب ''جاوید نامہ'' پڑھا دیجئے لیکن اس کے پڑھانے کے لیے ایسے لوگوں کی یا ایسے شخص کی ضرورت ہوگی جو علومِ حاضرہ کے اوپر پوری دسترس رکھتا ہو۔ یہ بڑی جامع کتاب ہے اور میں سمجھتا ہوں یہ اقبالؒ کی فکر کا شاہکار ہے۔ تاریخ عالم پہ نگاہ' مذاہبِ عالم پہ نگاہ' سارے فلسفے کے اوپر نگاہ' الٰہیات کے اوپر نگاہ' سوشیالوجی کے اوپر نگاہ' تمدن کے اوپر نگاہ' نظام کے اوپر نگاہ' سب سے بڑی یہ چیز کہ قرآن کی گہرائیوں کے اوپر بڑی نگاہ۔ اگر کہیں یہ چیز نصاب کی اس انداز سے سامنے آئے پھر آپ دیکھئے گا کہ انہی نوجوانوں کی ذہنیت کیسے بنتی ہے اور کیا بنتی ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ کوئی دوسری قوم آئے گی۔ بڑا حسین انداز ہے۔ اقبال کے الفاظ ہیں وہ اس انداز سے بات شروع کرتا ہے کہ یہ نظام آیا تو ملوکیت بھی گئی اور یہ پاپائیت بھی گئی اور سرمایہ داری بھی گئی یہ سب چیزیں انہوں نے اُڑا دیں۔ میرے دل کے اندر جو بات چھپی ہوئی ہے آج میں اسے بے نقاب کہہ دینا چاہتا ہوں۔ الفاظ نہیں مل رہے یہ کہنے کے لیے کہ میں کیا کہوں کہ یہ قرآن ہے کیا' یہ کتاب تو نہیں کچھ اور ہی ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ جب جان کے اندر کسی کے یہ اتر جاتی ہے تو جان بدل جاتی ہے اور جب جان بدل جاتی ہے تو دنیا بدل جاتی ہے''۔

(بحوالہ دروس القرآن سورۃ المائدہ آیات 51 تا 56)

منگوانے کا پتہ

ادارہ طلوعِ اسلام 25-B گلبرگ 2، لاہور۔54660، پاکستان
فون: 042-35714546 Idara@toluislam.com

غلام احمد پرویزؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ثواب ہوتا کیا ہے؟

انسان اپنا مفہوم الفاظ کے ذریعے بیان کرتا ہے۔ اسی لیے اسے حیوانِ ناطق کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ رفتہ رفتہ الفاظ باقی رہ جاتے ہیں اور جس مفہوم کے ادا کرنے کے لیے وہ وضع ہوئے تھے، وہ مفہوم گم ہو جاتا ہے۔ بظاہر یہ چیز کچھ عجیب سی نظر آئے گی کہ الفاظ باقی ہوں اور ان کا مفہوم گم ہو چکا ہو لیکن یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو بادنیٰ تعمق اُبھر کر سامنے آجاتی ہے۔ متعدّد الفاظ ہیں جنہیں ہم صبح سے شام تک بلا تکلف استعمال کئے جاتے ہیں لیکن کبھی نہیں سوچتے کہ بالآخر ان کا مفہوم کیا ہے؟ مذہبی دوائرِ حیات میں اس قسم کے الفاظ کی بڑی کثرت ہوتی ہے، اس لیے کہ ''مذہب'' کو زندگی کے عملی مسائل سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ اس کا تعلق سطحی جذبات سے ہوتا ہے اور جذبات، میں اس کی ضرورت ہی نہیں ہوتی کہ یہ سوچا جائے کہ جو الفاظ ہم استعمال کرتے ہیں ان کا مفہوم کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ''مذہب'' چونکہ انسان کے دورِ سحر (Magic Age) کی یادگار ہے اس لئے اس میں سارا زور الفاظ پر دیا جاتا ہے۔ ان کے مفہوم سے کچھ مطلب نہیں ہوتا۔ سحر کی خصوصیت ہی یہ ہوتی ہے کہ الفاظ (بلا مفہوم) کے الٹ پھیر اور اعادہ سے کام لیا جائے۔ تعویذوں کے الفاظ کو دیکھئے۔ عجیب مہملات کا مجموعہ دکھائی دیں گے۔ لیکن تعویذ لکھنے والے ان کی پابندی پر۔۔۔ اس قدر زور دیں گے کہ اگر ایک حرف میں بھی ردّوبدل ہو جائے تو وہ سمجھ لیں گے کہ اب اثر نہیں ہو سکتا۔ ''الفاظ بلا مفہوم'' یہ ہے ''مذہب'' کی صحیح تعریف۔

اسلام ''مذہب'' کے خلاف ایک صدائے احتجاج تھا۔ وہ مذہب کے بجائے دین لے کر آیا تھا جسے آج کل کی اصطلاح میں آئینی نظامِ زندگی کہا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ ایک نظامِ زندگی، نظری مسائل سے نہیں بلکہ زندگی کے عملی مسائل سے بحث کرے گا اور جب اس کی بحث کا دائرہ عمل مسائلِ حیات پر مشتمل ہوگا تو اس کے الفاظ واضح اور بیّن مفہوم کے پیکر ہوں گے۔ اس میں ''لفظ بلا معنیٰ'' کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکے گا۔ قانون اور آئین کی دنیا میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہوتا جس کا مفہوم ٹھیک ٹھیک متعین نہ کر دیا گیا ہو۔ اگر کسی لفظ کی تعریف (Dfefinition) میں ذرّا سا فرق ہو جائے تو اس سے پورے کا پورا قانون بدل جاتا ہے۔ اسی لیے قانون کی کتابوں میں ہر لفظ کی تعریف، متعین کر دی جاتی ہے۔ مثلاً چوری جرم ہے۔ لیکن قانون کی کتاب میں پہلے یہ بتایا جائے گا کہ چوری کہتے کسے ہیں۔ اس لفظ کا مفہوم کیا ہے۔ اسی متعینہ مفہوم کے مطابق یہ فیصلہ ہوگا کہ فلاں عمل، چوری کہلا سکتا ہے یا نہیں۔

اسلام جب ایک آئینی اور قانونی نظامِ زندگی اپنے ساتھ لایا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے ہر لفظ اور ہر اصطلاح کا مفہوم متعین ہوگا۔ بلا تعین مفہوم، نہ قانون، قانون رہ سکتا ہے نہ آئین، آئین۔ اسلام کا ضابطۂ آئین، قرآن ہے، اور قرآن کا

خاصہ ہے کہ وہ اپنے الفاظ کا مفہوم خود متعین کر دیتا ہے۔ اسی لیے وہ کتابِ مبین ہے۔ ''مذہبی منتروں'' کی کتاب نہیں ہے۔ لیکن جب قرآن کا دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا تو جس طرح ہر مذہب کی حالت ہے، اس کے الفاظ تو باقی رہ گئے۔ ان الفاظ کا مفہوم نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اب حالت یہ ہے کہ ہم صبح سے شام تک ان الفاظ کو دہراتے رہتے ہیں لیکن کبھی نہیں سوچتے کہ ان الفاظ کا مفہوم کیا ہے۔ انہی الفاظ میں ایک لفظ ''ثواب'' بھی ہے۔ مذہب پرست طبقہ میں دیکھئے۔ بات بات میں اس لفظ کو دہرایا جائے گا۔ یہ کرنے سے اتنا ثواب ہوتا ہے، وہ کرنے سے اتنا ثواب ملتا ہے۔ جس بات کے متعلق پوچھئے کہ ایسا کرنے سے کیا ہوگا تو اس کا جواب یہی ملے گا کہ اس سے ثواب ہوگا۔ لیکن اگر آپ پوچھ بیٹھیں کہ صاحب! ثواب ہوتا کیا ہے؟ تو آپ حیران رہ جائیں گے کہ اس کا کوئی معقول جواب آپ کو نہ ملے گا۔ آپ کو یہ بات بظاہر تعجب انگیز سی دکھائی دے گی۔ (اور ہر وہ بات جس پر پہلے پہل غور کرنے کی دعوت دی جائے تعجب انگیز نظر آیا کرتی ہے) لیکن جو کچھ ہم نے کہا ہے وہ امرِ واقعہ ہے، آپ دُور نہ جائیے، خود اپنے آپ سے سوال کر کے دیکھئے۔ آپ نے بھی تو اس لفظ کو متعدد بار بولا ہوگا۔ ذرا سوچئے تو سہی کہ آپ کے ذہن میں اس کا مفہوم کیا ہے؟ آپ کو اپنے ذہن سے زیادہ سے زیادہ یہ جواب ملے گا کہ ''ثواب'' کوئی ایسی چیز ہے جس سے قیامت میں جہنم کے عذاب سے نجات ملے گی۔ یعنی یہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کا تعلق آپ کی اس زندگی سے ہو۔ اس کا تعلق آخرت کی زندگی سے ہے اور وہاں کے متعلق کہا نہیں جا سکتا کہ وہاں کیا ہوگا اور کیسے ہوگا۔ یہ ہے ''ثواب'' کا وہ مفہوم جو آپ کے ذہن میں آئے گا یا آپ کو وہ شخص بتائے گا۔ جس سے آپ اس کا مفہوم پوچھیں گے۔

غور کیجئے کہ یہ لفظ ایسا ہے جس کا استعمال بات بات میں ہوتا ہے لیکن اس کا مفہوم ایسا مبہم بتایا جاتا ہے جس سے کچھ پلّے ہی نہیں پڑتا کہ بات کیا ہوئی! آپ سوچئے کہ اس کا نتیجہ کیا ہے؟ مذہب پرست طبقہ ہمیشہ شکایت کرتا رہتا ہے کہ مسلمان اسلام کے احکام کی پروا نہیں کرتے۔ ان کی زندگی مذہبی نہیں رہی۔ وہ اوامر نواہی کے پابند نہیں۔ یہ لوگ شکایت تو مسلسل کرتے رہتے ہیں لیکن کبھی اتنا سوچنے کی زحمت گوارا نہیں فرماتے کہ بالآخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ آپ ایک بچے سے تو اس طرح کام کرا سکتے ہیں کہ یہ کرو۔ وہ نہ کرو۔ بغیر بتائے ہوئے کہ ایسا کرنے سے کیا ہوگا اور ایسا نہ کرنے سے کیا۔ لیکن جب وہی بچہ صاحبِ فکر و شعور ہو جائے تو اس وقت آپ اس سے اس طرح احکام نہیں منوا سکتے۔ اس وقت آپ کو بتانا ہوگا کہ ایسا کرنے سے کیا ہوگا اور ایسا نہ کرنے سے کیا؟ ''مذہب'' کی تاکید یہ ہوتی ہے کہ ان معاملات میں عقل کو کوئی دخل نہیں، اس لیے تم ''کیوں'' نہ پوچھو، جو کچھ کہا جاتا ہے چپکے سے کیے جاؤ۔ انسانی ذہن اپنے عہدِ طفولیت میں تو اس طریقِ کار پر عمل پیرا ہو سکتا تھا لیکن جب وہ ''کیوں'' کے مقام تک پہنچ جائے تو پھر مجرّد حکم اس کے لیے محرّکِ عمل نہیں ہو سکتا۔ وہ حکم کی لم بھی سمجھنا چاہتا ہے۔ چونکہ قرآن، مذہب نہیں بلکہ دین لایا تھا، اس لیے اس نے ذہنِ انسانی کے اس تقاضے کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ کتاب (قانون یا حکم) کے ساتھ حکمت (اس کی لم۔ ''کیوں'') بھی بتا دی اور ہر مقام پر واضح کر دیا کہ ایسا کرنے سے کیا ہوگا اور ایسا نہ کرنے سے کیا؟ اس نے اپنی دعوت کی بنیاد ہی علم و بصیرت پر رکھی۔ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ

صاحبانِ عقل وبصیرت خود دیکھ سکتے ہیں کہ اس نظامِ حیات کے نتائج کیا ہوں گے۔ اس نے کھلے کھلے طور پر کہہ دیا کہ بدترینِ خلائق (شرالدواب) وہ انسان ہیں جو عقل وبصیرت سے کام نہیں لیتے۔ دنیا کا کوئی نظام ہو اس کی جاذبیت کا راز اس کے نتائج میں مضمر ہوتا ہے اور نتائج اس ٹھوس حقیقت کا نام ہے جو بلا حجاب ونقاب سامنے آجائے، مبہم الفاظ، غیر متعین مفہوم، کبھی نتائج کی جگہ نہیں لے سکتے۔ یہ ہے اصل وجہ اس امر کی کہ مسلمان ''مذہبی احکام'' کی پابندی نہیں کرتے۔ مبہم الفاظ، کبھی سوچنے والے ذہن کے لیے وجہ کشش نہیں ہو سکتے۔ ان سے صرف وہی طبقہ وابستہ رہ سکتا ہے جس کا ذہن ہنوز ''عہدِ طفولیت'' میں ہو۔ سوچنے والا ذہن، کتاب (حکم) کے ساتھ اس کی حکمت (لِم) کا بھی تقاضا کرتا ہے اور حکم کی لِم اس کے نتیجہ ہی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ دین (نظامِ زندگی) نتائج پیش کرتا ہے اور یہی نتائج اس کی کشش کا باعث ہوتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد، لفظ ثواب پر غور کیجئے۔ ثابؔ کے لغوی معنی ہیں کسی چیز کا لوٹ کر آجانا۔ کسی حوض کا اس طرح لبالب بھرے رہنا کہ جتنا پانی اس میں سے نکلے اتنا ہی اس میں واپس آتا رہے۔ استثاب کے معنی (Restoration) کے ہیں۔ یا کاروباری زبان میں یوں سمجھئے کہ آپ جو کچھ (Invest) کرتے ہیں۔ اس کی (Return) کو ثواب کہتے ہیں۔

آپ کوئی کام کیجئے۔ اس میں کچھ نہ کچھ صرف ہوگا۔ مال، وقت، توانائی (Energy) ذہنی ہو یا جسمانی۔ اگر اس کام کا نتیجہ اس صرف شدہ توانائی کو واپس لے آتا ہے تو وہ نتیجہ اس کا ثوابؔ ہوگا۔ ثاب جسمہٗ کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جسم سے جس قدر توانائی زائل ہوجائے وہ پھر واپس آجائے اور اس طرح جسم تنومند اور توانا رہے۔ مثلاً آپ سیر کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس میں آپ کی کچھ توانائی (Energy) صرف ہوتی ہے۔ لیکن وہ سیر آپ کی صحت کے لیے مفید ہے۔ اس لئے وہ استعمال شدہ توانائی کو واپس لاتا ہے اور آپ کی صحت کو بھی درست کرتا ہے جس سے آپ کی نشوونما ہوتی ہے۔ یہ سیر کا ثوابؔ ہے۔ اسلام کے نظام (الدّین) میں ہر فرد اپنے مفوضہ فرائض کو سرانجام دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں ان افراد کا وقت، مال، توانائی، ذہنی اور قلبی قوتیں صرف ہوتی ہیں۔ اس نظام کے اجتماعی نتائج ان صرف شدہ قوتوں کو بھی واپس دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ارتقائے انسانیت کا وہ مقصدِ کلّی بھی پورا ہوتا (اور آگے بڑھتا) رہتا ہے جس سے انسان، کارگۂ عالم کے تحقیقی پروگرام میں، خدا کا رفیق بنتا ہے۔ اس قرآنی نظامِ زندگی کے نتائج کو ''ثواب اللہ'' کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے جہاں فرمایا کہ:

ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ (28:80)

جس نے اس نظام کی حقانیت کو تسلیم کرلیا اور اس کے بعد صلاحیت بخش کام کئے، ان کے لیے اس نظام کے نتائج بڑے خوشگوار ہوں گے۔

لہٰذا، ثواب اللہ کے معنی ہیں اس نظامِ زندگی کے جیتے جاگتے نتائج جو قرآنی اصولوں کے مطابق قائم کیا جائے۔ لیکن قرآن نے اس لفظ (ثواب) کے انتخاب (اور استعمال) سے ایک اور اہم حقیقت کو بھی بے نقاب کردیا ہے۔ ''مذہب'' کی عمارت، ثنویت (Dualism) پر قائم ہوتی ہے۔ یعنی اس میں دنیا اور آخرت، روح اور مادہ، ملک ودین کو دو الگ الگ

شعبے قرار دیا جاتا ہے جن میں نہ صرف یہ کہ باہمی کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک دوسرے کے نقیض اور مخالف ہوتے ہیں اور دونوں ایک جگہ سما نہیں سکتے۔ لیکن قرآن نے اس ثنویت (دین اور دنیا کی علیحدگی) کو تصوّرِ باطل قرار دیا اور اعلان کر دیا کہ نظامِ زندگی ان دونوں کے تانے اور بانے سے مل کر بنتا ہے۔ نہ اکیلا تانا کسی مطلب کا ہوتا ہے نہ بانا۔ دیکھئے کہ قرآن نے اس حقیقت کو کس حسن وخوبی سے، دو لفظوں میں نکھار کر رکھ دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدًی ؕ (75:36) اِس کا عام طور پر ترجمہ کیا جاتا ہے ''کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ اسے بیکار چھوڑ دیا گیا ہے؟'' لیکن اس کے صحیح مفہوم کا راز لفظ سُدًی میں ہے۔ سُدًی کے معنی ہیں کپڑے کا تانا۔ یعنی صرف تانا ہی تانا۔ اس کے ساتھ بانا نہیں۔ لہٰذا اس آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ انسان کا یہ تصور کہ زندگی صرف تانے ہی تانے کا نام ہے، تصورِ باطل ہے۔ تانا اور بانا الگ الگ رکھئے'' اس سے کپڑا نہیں بن سکتا۔ جب ان دونوں کو ایک دوسرے میں بُن دیا جائے تو وہ کپڑا بن جاتا ہے۔ کپڑے کو ثوب کہتے ہیں۔ یعنی مستقل اور درخشندہ نتائج صرف اسی نظام سے مرتب ہو سکتے ہیں جس میں روح اور مادہ، دنیا اور آخرت اور ملک ودین کو باہمد گر سمو دیا جائے اور اس طرح حالتِ سدی کو کیفیتِ ثوبی سے بدل دیا جائے۔ اسی تبدیلی کو ثواب کہا جائے گا۔

دنیا کے عام نظام ہائے معاشرت (جن کی اساس مستقل اقدار پر نہیں ہوتی) طبعی قوانین کے مطابق اپنے نتائج مرتب کرتے ہیں۔ جو شخص اچھی خوراک کھائے گا تندرست وتوانا رہے گا۔ لیکن ان نتائج کا تعلق انسان کے پیش پا افتادہ مفاد تک ہی محدود ہوتا ہے۔ وہ زندگی کی جوئے رواں کے ساتھ ساتھ نہیں چلتے۔ انہیں قرآن ثواب الدنیا کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ ان لوگوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ ذرا سوچو! یہ تمہاری کیسی بھول ہے کہ تم اتنی تگ وتاز بھی کرتے ہو لیکن اس کے بعد صرف قریبی مفاد پر اکتفا کر کے بیٹھ جاتے ہو۔ اگر تم اپنے معاشرے کو مستقل اقدار (وحی) کے خطوط پر متشکل کر لو تو اسی تگ وتاز سے یہ قریبی مفاد بھی حاصل ہو جائیں اور ان کا سلسلہ آگے بھی بڑھتا جائے۔ ان نتائج کا نام ثَوَابُ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ ؕ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مَنْ کَانَ یُرِیْدُ ثَوَابَ الدُّنْیَا۔ ''جو لوگ صرف قریبی مفاد تک ہی رُک کر رہ جاتے ہیں'' ان سے کہو کہ فَعِنْدَ اللّٰہِ ثَوَابُ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ ؕ (4:134) نظامِ خداوندی میں قریب اور بعید دونوں کے مفاد حاصل ہوتے ہیں۔ سو بتاؤ کہ یہ نظام اچھا ہے یا تمہارا نظام۔ ظاہر ہے کہ نظام وہی اچھا ہوگا جس کے نتائج کا سلسلہ حیاتِ انسانی کے ساتھ آخرت تک مسلسل قائم رہے۔ اسی لیے قرآن نے کہا ہے کہ اپنے سامنے ہمیشہ یہ آرزو رکھو کہ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً (2:201) دنیا اور آخرت دونوں کے خوشگوار نتائج انسانی زندگی کے ساتھ ساتھ رواں دواں چلتے رہیں اور اس طرح یہاں سے آخرت تک شاہراہِ حیات شگفتہ وشاداب رہے۔ یہ ہے الدین کا وہ نظام جس میں ثَوَابُ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ ؕ، دونوں حاصل ہوتے ہیں۔

دوسرا نظام وہ ہے جسے دنیا کی قومیں اپنی مصلحت کوشیوں کے ماتحت وضع کرتی ہیں اور اپنی نگاہوں کو صرف اسی زندگی تک محدود رکھتی ہیں۔ اس نظامِ زندگی کے نتائج اسی دنیا تک محدود رہتے ہیں۔۔۔ وَمَا لَہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنْ خَلَاقٍ۔ اس کے

بعد کی زندگی میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ یہ خالص دنیاداری کی زندگی ہے۔ یعنی سیکولرازم۔

تیسرا نظام وہ ہے جس میں نہ اس زندگی کی خوشگواریاں حاصل ہوتی ہیں نہ اس کے بعد کی زندگی کی۔ یہ ہے ''مذہب کی زندگی''۔ اس زندگی میں انسان اپنے آپ کو اس دھوکے میں رکھتا ہے کہ اگر ہماری موجودہ زندگی چند روزہ ہے۔ اس کے بعد حیاتِ ابدی کی ہمیشہ رہنے والی خوشگواریوں کے ہم ہی مالک ہیں۔ لیکن قرآن کی رُو سے یہ بہت بڑا دھوکا ہے۔ نفس کا فریب ہے وہ کہتا ہے کہ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا۔ کیا تمہیں بتاؤں کہ وہ لوگ کون ہیں جن کے کاموں کا نتیجہ خسارہ ہی خسارہ ہے۔ ''اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا''۔ ''یہ وہ لوگ ہیں جن کی کوششیں دنیاوی زندگی میں غلط راہوں پر پڑ جاتی ہیں۔'' وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا۔ لیکن وہ بزعمِ خویش یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے نیک کام کر رہے ہیں۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو درحقیقت قانونِ خداوندی کا عملی انکار کرتے ہیں۔ اس طرح کہ حقائق کا آمنا سامنا کرنے (To Face Realities) کی بجائے وہ ان سے گریز کی راہیں نکالتے ہیں۔ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ان کے کام بظاہر بڑے خوش آئندہ دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کا نتیجہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا (18:102-105) ''یہ اعمال ایسے بے نتیجہ ہوتے ہیں کہ قیام انسانیت کے سلسلہ میں ان کا وزن تک معلوم کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ بالکل بے وزن ہوتے ہیں۔'' مذہب پرست طبقہ اپنے آپ کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیتا ہے کہ اگر ہماری آج کی دنیا خوشگوار نہیں تو نہ سہی۔ آخرت کی نعمتیں تو ہمارے ہی لئے ہیں۔ لیکن یہی ان کی بھول ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (17:72) ''اس دنیا کا اندھا اُس دنیا میں بھی اندھا ہی رہے گا۔'' یہ ہو نہیں سکتا کہ آج کی دنیا ذلیل اور خوار ہو اور کل کی دنیا میں ساری سرفرازیاں انہیں کے حصہ میں آ جائیں۔ لہٰذا:

(1) اسلام کے نظامِ حیات میں امروز اور فردا دونوں خوشگوار ہوتے ہیں۔

(2) عام دنیاوی نظام میں، صرف امروز خوشگوار ہوتا ہے۔

(3) اور مذہب کی دنیا میں نہ آج خوشگوار ہوتا ہے نہ کل۔ ایک مقدس دھوکا ہوتا ہے اور بس۔ وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا۔ ''ہم صدیوں سے اس مقدس دھوکے میں مبتلا ہیں۔''

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کی رُو سے ثواب کے معنی ہیں:

اعمالِ حیات کے وہ زندہ اور مثبت نتائج جو محسوس شکل میں ہمارے سامنے آ جائیں اور جس سے ہماری دنیاوی زندگی بھی خوشگوار ہو اور بعد کی زندگی بھی۔

جو اعمالِ حیات، اپنے محسوس نتائج پیدا نہیں کرتے۔ یاد رکھئے کہ ان کا کوئی ثواب نہیں ملتا۔

اب آپ اپنے لیے خود میزان قائم کر کے دیکھ لیجئے کہ آپ کے کون کون سے اعمال ایسے ہیں جن کا ثواب ہوتا ہے اور

کون کون سے ایسے جن کا کوئی ثواب نہیں ہوتا۔

اے مسلماں! اپنے دل سے پوچھ مُلّا سے نہ پوچھ۔



وضاحت:

میرا یہ مقالہ 1951ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کی اہمیت اس کے متن سے واضح ہے۔ لیکن اس کی اس وقت (بارِ دیگر) اشاعت کی ایک خاص وجہ ہے۔ پچھلے دنوں طلوعِ اسلام میں جو مقالات شائع ہوئے، جن میں بتایا گیا ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، صیام (روزوں) اور حج کا مقصد کیا ہے، تو اس سلسلہ میں مجھے بہت سے استفسارات موصول ہوئے، جن کا ملخص یہ ہے:

> آپ نے روزوں کا مقصد یہ بتایا ہے کہ اس میں اُمت اس قابل ہوجاتی ہے کہ دنیا میں خدا کی کبریائی (قرآن کی حکومت) قائم کرے، اور حج سے مقصد یہ ہے کہ اقوامِ عالم آکر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ یہ اُمت ان کی منفعت کے لیے کیا کچھ کر رہی ہے۔ لیکن ہمارے مروجہ روزوں اور حج (بلکہ نماز اور زکوٰۃ تک) سے وہ مقاصد حاصل نہیں ہوتے جو قرآنِ مجید نے بتائے ہیں۔ اسی سے ذہن لامحالہ اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ ہمارے یہ اعمال ''فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ'' کے زمرہ میں شامل ہوتے ہیں۔ یعنی رائگاں جاتے ہیں۔ لیکن مولوی صاحبان بتاتے ہیں کہ ایسا نہیں۔ ان کا ثواب ملتا ہے اور یہ بہت بڑا اجر ہے۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟ اور اگر ایسا ہے تو کیا یہ سمجھ لیا جائے کہ جن اعمال اور شعائر کے وہ نتائج مرتب نہیں ہوتے جو قرآنِ مجید نے بتائے ہیں، وہ رائگاں نہیں جاتے۔ ان کا ثواب ملتا ہے؟ پھر یہ بھی بتایئے کہ ''ثواب'' ہوتا کیا ہے؟

اس قسم کے ہیں وہ استفسارات جو مجھے موصول ہوئے اور جن کی بنا پر میں نے اپنے 1951ء کے مقالہ کی دوبارہ اشاعت اور اس کے ساتھ یہ مزید وضاحت ضروری سمجھی۔

قرآنِ کریم ایک نظامِ زندگی (الدین) عطا کرتا، اور اسے قائم کرنا اُمتِ مسلمہ کا فریضہ قرار دیتا ہے۔ یہ نظام اسی دنیا میں قائم ہوتا ہے اس لیے (ہر نظامِ زندگی کی طرح) اس کے محسوس نتائج اسی دنیا میں سامنے آجاتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے کہ یہ پرکھا جاسکے کہ یہ نظام صحیح شکل میں قائم ہوا ہے یا نہیں، قرآنِ مجید میں اس کے نتائج کو بھی خود ہی واضح کر دیا گیا ہے۔ صوم وصلوٰۃ یا زکوٰۃ وحج وغیرہ اس نظام کے پروگرام کے مختلف گوشے ہیں۔ اور جنہیں ہم ان کے مقاصد کہتے ہیں، وہ درحقیقت ان کے محسوس نتائج ہیں جو اس نظام کے قیام سے سامنے آتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے ان نتائج یا مقاصد کا ماحصل، مختصر ترین، اور اس کے ساتھ ہی حسین ترین الفاظ میں متعین کر دیا ہے،۔۔۔ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً (2:201)۔ یعنی ان سے انسان (کی انفرادی اور اجتماعی) زندگی سنور جاتی ہے۔ حسین ہوجاتی ہے۔ اس اجمال میں، زندگی کی ہر طرح کی خوشگواریاں، شادابیاں، سرفرازیاں، کامرانیاں ـــــ حکومت، دولت، سطوت اور اس کے ساتھ ہی امن اور سکون اور خوف وحزن سے

مامونیت شامل ہیں۔ یہ نتیجہ ہوتا ہے ان ارکان کی ادائیگی کا۔

لیکن چونکہ (قرآن کی رُو سے) زندگی، اِسی دنیا کی زندگی نہیں۔ اس لیے اس نظام کے قیام سے مرنے کے بعد کی زندگی (حیاتِ آخرت) بھی سنور جاتی ہے۔ وہاں کی فوز وفلاح بھی حاصل ہوجاتی ہے۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً کے ساتھ وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً۔۔۔(2:201) کا اضافہ بھی کر دیا۔

یہ ظاہر ہے کہ آخرت کی حسنات کا ہم، اس دنیا میں رہتے ہوئے، مشاہدہ نہیں کر سکتے۔ اس لیے ہم ___ ''اُخروی حسنات'' کی رُو سے اس امر کا جائزہ نہیں لے سکتے کہ یہ ارکان اپنا نتیجہ پیدا کر رہے ہیں یا نہیں۔ اس کا جائزہ انہی نتائج سے لیا جاسکے گا، جو اس دنیا میں محسوس طور پر سامنے آجائیں۔ اگر ان ارکان کی ادائیگی سے اِس دنیا کی خوشگواریاں اور سرفرازیاں حاصل ہوتی ہیں۔ ہم الْاَعْلَوْنَ کے مقام پر پہنچ جاتے ہیں۔ یعنی تمام اقوامِ عالم پر غالب آجاتے ہیں، تو سمجھا جائے گا کہ یہ ارکان صحیح طور پر ادا ہو رہے ہیں۔ نیز یہ کہ ہماری عاقبت بھی سنور رہی ہے اور اگر ہمیں یہاں یہ امتیازات حاصل نہیں۔ تو پھر ہماری عاقبت بھی سنور نہیں سکتی۔ یہ ایک ایسا (Test) ہے جس سے نہ کوئی غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے۔ نہ انسان خود فریبی میں مبتلا رہ سکتا ہے۔

یہی وہ (Test) تھا جسے نبی اکرم ﷺ نے اس نظام کے مخالفین کے سامنے پیش کیا تھا۔ آپ نے ان سے کہا تھا کہ، یہ دیکھنے کے لئے کہ جو دعوت میں پیش کرتا ہوں وہ مبنی برصداقت ہے یا وہ دعوت جسے تم پیش کرتے ہو، کسی بحث ومباحثے، جھگڑے، جھمیلے کی ضرورت نہیں۔ اس کا طریق بڑا صاف اور سیدھا ہے اور وہ یہ کہ:

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (6:135)

اے میری قوم کے لوگو! تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرو، مجھے میرے پروگرام کے مطابق کام کرنے دو۔ نتائج خود، بخود، اور بہت جلد بتا دیں گے کہ آخرالامر کامیابی کس کے حصے میں آتی ہے اور ظالمین کس طرح ناکام رہ جاتے ہیں۔

دوسری جگہ ہے۔۔۔ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ۭ (11:93) ''تم بہت جلد دیکھ لوگے کہ کون تباہ وبرباد اور ذلیل وخوار ہوتا ہے اور اس طرح یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا۔''

آپ غور کیجئے! حضور ﷺ نے ان سے یہ نہیں کہا تھا کہ تم اپنے طور پر پوجا پاٹ کرتے رہو، ہمیں اپنے طریق سے نماز، روزہ ادا کرنے دو۔ اس کے بعد قیامت میں جا کر دیکھ لینا کہ کون سچا تھا اور کون جھوٹا۔ حضورؐ نے ان سے کہا تھا کہ تم بہت جلد دیکھ لوگے کہ کون ذلیل وخوار ہوتا ہے، اور کون کامیاب وکامران۔

اور اس (Test) کے نتائج کو اُسی قوم نے نہیں۔ ساری دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اعمال انسانی کے نتائج کو

قرآنِ کریم کی اصطلاح میں ثواب کہا گیا ہے، خواہ وہ غلط نظام کے نتائج ہوں اور خواہ صحیح (قرآنی) نظام کے۔ غلط نظام کے نتائج کے متعلق کہا: هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ (83:36) ''یہ مخالفین جس قسم کے کام کرتے ہیں، انہی کے نتائج ان کے سامنے آئیں گے۔''

جہاں تک قرآن نظام کا تعلق ہے اس کے ثواب کو ایسے واضح محسوس۔ غیر مبہم الفاظ میں بیان کیا گیا ہے جس میں کسی قسم کی غلط فہمی کا امکان نہ ہو۔ صلح حدیبیہ کے وقت ایسا نازک مقام آ گیا تھا جہاں ان مجاہدین نے ''اپنی جان و مال کے بیچ دینے'' کے معاہدہ کی تجدید کی تھی۔ اس کے ''ثواب'' کے سلسلہ میں فرمایا:

وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا ۝ وَمَغَانِمَ كَثِيرَةً يَأْخُذُونَهَا ۔۔۔ (48:18-19)

خدا نے ان کے لیے مستقبل قریب میں فتوحات کی راہیں کھول دیں اور بہت سا مالِ غنیمت بھی ان کے ہاتھ آیا۔

آپ نے غور فرمایا کہ انہیں ان کے حسنِ عمل کا ''ثواب'' کس شکل میں ملا؟ یہ ثواب الدنیا تھا اور ثواب الآخرۃ، اس پر مستزاد، بلکہ اسی کا لاحقہ تھا۔ یہ انہی کی خصوصیت نہیں تھی۔ انبیاءؑ سابقہ کی جماعتوں کو بھی اس قسم کا ثواب ملتا رہا تھا۔ سورۂ آلِ عمران میں، جماعتِ مومنین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

یہ بات کہ تمہیں اپنے مخالفین کا مقابلہ کرنا ہوگا، کوئی نئی بات نہیں۔ تم سے پہلے کتنے ہی نبی گزرے ہیں جن کی معیت میں نظامِ ربوبیت کے علمبرداروں نے مخالفین سے جنگ کی۔ اس راہ میں انہیں جو تکالیف پیش آئیں ان سے نہ تو ان کے عزائم میں لغزش آئی، نہ ان میں کمزوری پیدا ہوئی۔ نہ ہی وہ مسلسل محنت سے تھک کر ہمت ہار گئے اور انہوں نے ہتھیار رکھ دیئے۔ وہ ان تمام مراحل میں ثابت قدم رہے اور خدا کا قانونِ مکافات ان کا ساتھ دیتا رہا۔

یہ لوگ اپنے آہنی عزم کے ساتھ آگے بڑھتے رہے۔ ان کی زبان پر اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! اگر ہم سے کوئی لغزش یا کوتاہی ہو جائے، یا کسی معاملہ میں حد سے آگے بڑھ جائیں، تو ہماری ان غلطیوں کے مضر اثرات سے ہمیں محفوظ رکھنا۔ ہمیں ثابت قدم رہنے کی توفیق دینا اور مخالفین پر غلبہ اور کامیابی عطا کرنا۔ (3:145-146)

''اعمال کا اندازہ آپ نے لگا لیا۔ اب ان کا ''ثواب'' ملاحظہ فرمایئے۔ ارشاد ہوا:

فَآتَاهُمُ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۝ (3:148)

ان کے اعمال کے بدلے میں خدا نے انہیں دنیاوی زندگی کی خوشگواریاں (ثواب الدنیا) بھی عطا کیں اور اُخروی زندگی کی نعمتیں (ثواب الاخرۃ) بھی۔ یہ ہیں حسنِ اعمال کے وہ پیکر جو خدا کے نزدیک پسندیدہ قرار پاتے ہیں۔ (نیز 4:134)

آپ نے غور فرمایا کہ ''ثواب'' کا مفہوم کیا ہے؟ یہ تھا صوم، صلوٰۃ، زکوٰۃ، حج وغیرہ شعائر وارکان کا وہ ثواب، جو الدین کے زمانے میں حاصل ہوتا تھا۔ وہ بائیس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی ایسی مملکت جس میں کوئی فرد نہ کسی کا محتاج تھا نہ محکوم، اور جس کی طرف دنیا کی بڑی سے بڑی سلطنت بھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتی تھی۔ کیونکہ ان کے خدا کا ارشاد تھا کہ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ۝ (4:141) ''یہ ہو نہیں سکتا کہ غیر مسلم، مومنین پر غلبہ حاصل کرنے کی راہ پالیں۔''

اس کے بعد، اس اُمت پر ملوکیت چھا گئی اور دین، مذہب میں بدل گیا۔ مذہب کی ٹیکنیک یہ ہوتی ہے کہ وہ دین کے ارکان وشعائر کی شکل وصورت تو بدستور قائم رکھتا ہے لیکن ان کے مقصد وغایت (نتائج) کو نگاہوں سے اوجھل کر دیتا ہے۔ یہ ٹیکنیک کامیاب رہی، لیکن اس کے بعد لوگوں نے پوچھنا شروع کیا کہ ہم ان ارکان کی ادائیگی کیوں کریں؟ اس سے ہمیں حاصل کیا ہوگا؟ اس سے ہمیں کیا ملے گا؟ یہ سوال بڑا مشکل تھا لیکن انہوں نے اس کا بہت آسان حل تلاش کر لیا۔ انہوں نے کہا کہ اس سے تمہیں ''ثواب'' ملے گا اور جب پوچھا گیا کہ ثواب سے حاصل کیا ہوگا تو کہہ دیا کہ آخرت کی نجات۔ یعنی ''ثواب الدنیا'' کو غائب کر کے، انہیں ثواب الآخرۃ کی اصطلاح سے مطمئن کر دیا، جس کے لئے نہ کسی دلیل کی ضرورت تھی، نہ ثبوت کی حاجت! ''ثواب الدنیا'' سے اسی دُنیا میں محسوس ومرئی نتائج سامنے آتے تھے۔ ''ثواب الآخرۃ'' سے صرف جذبات کی تسکین ہوگئی، ہر شخص صبر آزما محنت مشقت کے بعد مطمئن ہو گیا کہ اس نے اس قدر ثواب کما لیا ہے۔

یہیں سے حبطِ اعمال کا مفہوم سمجھ میں آجاتا ہے۔ 1951ء کے مقالہ میں سورۃ الکہف کی جو آیات درج کی گئی ہیں ان میں ایک نکتہ سارا مطلب واضح کر دیتا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں: وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا (18:104) ''جو نہایت نیک نیتی سے سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے اچھے (نیک) کام کر رہے ہیں۔'' ظاہر ہے کہ یہ کوئی جرائم پیشہ لوگ تو ہو نہیں سکتے۔ ان میں سے کوئی بھی یہ نہیں سمجھتا کہ وہ نیک کام نہیں کر رہا ہے یہ لامحالہ وہ لوگ ہیں، جو غیر اسلامی نظام میں رہتے ہوئے مذہبی رسوم وارکان کو پابندی سے ادا کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد مطمئن ہو جاتے ہیں کہ وہ بڑے نیک کام کرتے ہیں۔ ان اعمال کے رائیگاں جانے کا مطلب یہ ہے کہ جن مقاصد کے حصول کے لیے انہیں متعین کیا گیا تھا، ان سے وہ مقاصد حاصل نہیں ہوتے۔ ان کی ادائیگی سے، فرد متعلقہ کو جھوٹا اطمینان حاصل ہو جاتا ہے، اور بس۔ یہ کیفیت ہر رسم کی ہوتی ہے۔ ہم معاشرتی رسوم کو، ان کی جزئیات تک کی پابندی کے ساتھ نہایت احتیاط سے ادا کرتے ہیں۔ ہم ایسا کیوں کرتے ہیں، اس کا جواب کوئی نہیں دے سکے گا، لیکن اس سے ہمیں اطمینان حاصل ہو جاتا ہے کہ ہم نے ایک ضروری کام کر لیا۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو دل پر ایک بوجھ سا رہتا ہے اور انسان اپنے آپ کو مجرم محسوس کرنے لگ جاتا ہے۔ لڑکی کو گھر سے وداع کرتے وقت اس کے پیچھے چاول کیوں چھڑکے جاتے ہیں، اس کا جواب کوئی نہیں دے سکے گا، لیکن اگر ایسا نہ کیا جائے تو مدّت تک دل دھڑکتا رہے گا کہ (خدانخواستہ) کوئی آفت نہ آجائے! جب یہ رسوم وضع ہوئی تھیں تو ان کی کوئی نہ کوئی غرض وغایت

ضرور ہوگی۔ لیکن مرورِ زمانہ سے وہ غرض وغایت تو نگاہوں سے اوجھل ہوگئی اور صرف رسوم باقی رہ گئیں۔ دین کے پروگرام کے اجزاء جب مذہبی رسوم بن جائیں، تو اُن کی کیفیت بھی ایسی ہی ہوجاتی ہے۔ (مثلاً) ہم میں سے کوئی نہیں بتا سکتا کہ ہم مُردے کے لیے دعائے مغفرت میں ''ایک بار الحمد اور تین بار قُل کیوں پڑھتے ہیں، لیکن ایسا کر دینے سے ہمیں سکون سا حاصل ہوجاتا ہے اور اگر کبھی ایسا ہو کہ ''تین بار قل'' کہ جگہ ''دو بار قل'' پڑھ دیئے گئے ہوں، تو وہ سکون جاتا رہتا ہے اور دل پر گرانی سی محسوس ہونے لگ جاتی ہے ___ اور قلوں اور تسبیحوں تک ہی کیا موقوف ہے؟ آپ مذہب کے بڑے سے بڑے رُکن (مثلاً) حج کے متعلق کسی سے پوچھئے کہ آپ حج کیوں کرتے ہیں؟ تو اس کے جواب میں وہ اتنا ہی کہہ سکے گا کہ یہ فریضۂ خداوندی ہے جسے مَیں ادا کرتا ہوں اور اگر آپ اس سے پوچھیں کہ اس سے ہوتا کیا ہے؟ تو وہ نہایت نیک نیتی سے کہے گا کہ وہاں جا کر جو سرور اور سکون حاصل ہوتا ہے، اسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن دمعاف بفرمائید) یہی جواب ہندو، سکھ، عیسائی سب کی طرف سے ملتا ہے۔ وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا کی کیفیت ہر مذہب میں ہوتی ہے۔ ہر ایک اپنے اپنے طریق پر عمل کر کے، اپنے آپ کو مطمئن کر لیتا ہے کہ اس نے بہت بڑا نیکی کا کام کر لیا ہے۔

آیت (18:104) میں صُنْعًا کا لفظ اور بھی معنی خیز ہے۔ اس کے معنی ہیں مصنوعی، یعنی حقیقی نہیں بلکہ بناوٹی۔ ملمع شدہ، مصنوعی شے دیکھنے میں اصلی نظر آتی ہے لیکن درحقیقت وہ اصلی نہیں ہوتی۔ اصلی اور مصنوعی کا فرق اس وقت سامنے آتا ہے جب اس مصنوعی شے کو کسوٹی پر پرکھا جائے۔ دین میں کسوٹی ہوتے ہیں وہ نتائج جو ان اعمال سے مرتب ہو کر سامنے آئیں۔ آپ دیکھئے کہ قرآنِ کریم نے ایک آیت میں اس حقیقت کو کس قدر نمایاں طور پر بیان کر دیا ہے۔ فرمایا:

اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ۔۔۔

اے رسول! جو کچھ تجھ، پر قرآن میں وحی کیا جاتا ہے اسے لوگوں کے سامنے پیش کر، اور صلوٰۃ (کا نظام) قائم کر۔

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ۔۔۔ ''یہ حقیقت ہے کہ صلوٰۃ، معاشرہ سے ہر قسم کے بے حیائی کی باتوں اور دیگر برائیوں کو روک دیتی ہے۔ ان کا سدِ باب کر دیتی ہے۔'' یہ ہے حقیقی صلوٰۃ، اور اس کا محسوس نتیجہ۔ لیکن یہ نتیجہ اسی صورت میں پیدا ہوگا۔ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۔۔۔ جب معاشرہ میں اقتدارِ اعلیٰ قانونِ خداوندی کو حاصل ہو۔'' اگر ایسا نہ ہو، تو پھر یہ صلوٰۃ، مصنوعی نماز بن کر رہ جاتی ہے۔ فرمایا: وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ (29:45) ''خدا خوب جانتا ہے کہ تم اس قسم کی مصنوعی صلوٰۃ (نماز) پڑھ کر اپنے آپ کو کس قدر مغالطہ میں رکھتے ہو کہ ہم نے بڑا نیک کام کر لیا!

اس سے واضح ہے کہ جس صلوٰۃ کا نتیجہ یہ نہیں کہ معاشرہ سے ہر قسم کی بے حیائی اور برائی کا سدِ باب ہوجائے۔ معاشرہ سے برائیاں ختم ہوجائیں، وہ الصَّلٰوةَ مَا تَصْنَعُوْنَ کے زمرے میں آجاتی ہے۔ یعنی مصنوعی ہوتی ہے، حقیقی نہیں ہوتی۔

اس قسم کی مصنوعی صلوٰۃ کو دوسری جگہ میکانکی نقل وحرکت (Mechanical Movements) کہہ کر پکارا ہے۔ سورۃ الماعون میں ہے: فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ (107:5-6) ''سو تباہی ہے ان نمازیوں کے لیے جو صلوٰۃ

کے حقیقی مقصود و منتہیٰ سے بے خبر رہتے ہیں۔ اَلَّذِیْنَ ھُمْ یُرَآءُوْنَ ۙ وَیَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۧ (107:6-7) اور خدا کے عطا کردہ اس رزق کو جسے مفادِ عامہ کے لیے رواں دواں رہنا چاہئے۔ بند لگا کر روک لیتے ہیں۔'' یہ ہوتا ہے نتیجہ ''مصنوعی اور میکانکی صلوٰۃ'' کا!

اب اس نکتہ کی طرف آیئے کہ فَلَا نُقِیْمُ لَھُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَزْنًا۔۔۔(18:105) ''ان کے اعمال کے تولنے کے لیے، میزان تک کھڑی نہیں کی جائے گی۔'' قرآن کریم میں ہے کہ عمل خیر کا بھی ذرہ ذرہ تولا جائے گا اور عمل شر کا بھی۔ تو یہ کس قسم کے اعمال ہیں جن کے تولنے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی؟ عمل خیر اپنا خوشگوار نتیجہ مرتب کرتے ہیں۔ عمل شر، تخریبی اور تباہ کن نتائج پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے ان کے موازنہ کی ضرورت ہوگی کہ کس قسم کے اعمال کا پلڑا بھاری ہوتا ہے۔ لیکن جو اعمال کسی قسم کا نتیجہ ہی پیدا نہ کریں، انہیں تولا کس مقصد کے لیے جائے گا؟ یہ تو، وقت، توانائی، دولت کا ضیاع ہے، اس لیے یہ اعمال رائیگاں جائیں گے۔ (فَحَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ)

انگریزی زبان میں ایک لفظ ہے۔ (Moral) اسے عملِ خیر کہہ لیجئے۔ دوسرا لفظ ہے (Immoral) اسے عملِ شر سے تعبیر کر لیجئے۔ تیسرا لفظ ہے۔ (Amoral) یعنی جو نہ خیر ہو نہ شر۔ قرآنِ کریم کی رُو سے رائگاں جانے والے اعمال کا شمار انہی میں ہوگا۔ یعنی وہ اعمال جو کوئی نتیجہ پیدا نہ کریں ___ نتیجہ تو یہ کوئی پیدا نہیں کرتے لیکن ان سے وقت، توانائی، مال و دولت کا جو نقصان ہوتا ہے وہ تو ظاہر ہے۔ ہزار برس سے ہمارے ساتھ یہی ہو رہا ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، تمام ارکانِ دین ''نہایت باقاعدگی اور پابندی سے ادا ہو رہے ہیں، لیکن اُمّت پست سے پست تر سطح پر پہنچتی چلی جا رہی ہے۔ ہم کبھی کھڑے ہو کر سوچتے نہیں کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ اس کے برعکس، اسی روش پر اور شدّت سے گامزن ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس کی وجہ، ''ثواب'' کا وہی مذہب پرستانہ مفہوم ہے۔

یہ اجتماعی نظام قائم تھا تو اس کا چیلنج تھا کہ دنیا کا کوئی نظام اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہ مذہب (یعنی انفرادی جذبات کی تسکین بہم پہنچانے کا ذریعہ) بن گیا تو دیگر مذاہب کی سطح پر آ گیا۔ اِسی بنا پر (مولانا) ابوالکلام آزاد (مرحوم) جیسوں نے ''تمام مذاہب یکساں ہیں'' کا نعرہ بلند کر دیا۔ یہ نعرہ تھا بھی (خود ساختہ) صداقت پر مبنی۔ ''مذاہب'' واقعی سب یکساں ہوتے ہیں کیونکہ ان کی غایت، افراد کے جذبات کی تسکین ہوتی ہے، اور یہ مقصد ہر مذہب میں حاصل ہو جاتا ہے۔ اسلام کو مذہب کی سطح پر رکھ کر، آپ ہزار مباحثے اور مناظرے کرتے رہئے۔ اسے آپ کبھی دیگر مذاہب سے افضل ثابت نہیں کر سکیں گے۔ وہ تو دین تھا جو تمام مذاہب ہی سے نہیں، تمام ادیانِ عالم (دیگر نظام ہائے حیات) سے بھی افضل تھا ___ افضل ہی نہیں بلکہ منفرد، اور بے مثال اور بے نظیر! اس لئے اس کا پروگرام (صوم وصلوٰۃ وزکوٰۃ وحج وغیرہ) نتائج پیدا کرتا تھا، دنیا کا کوئی نظام اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ جب ان ارکان کا مقصد (مرّوجہ اصطلاح میں) حصولِ ثواب رہ گیا تو یہ دیگر مذاہب کی سطح پر آ گیا۔

یہ تھا وہ کام جو مذہبی پیشوائیت نے ''ثواب'' کی اصطلاح سے لیا۔ حتیٰ کہ اس سے ''ایصالِ ثواب'' کا عقیدہ وضع کر کے، مُردوں کو بھی بخشوانے لگ گئے ___ ثواب (یعنی قرآنِ کریم کے مفہوم کا ثواب) اور اِسے مُردوں کو پہنچانا! جو چاہے

آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے! ملوکیت پشت پناہ رہے تو کوئی پوچھ ہی نہیں سکتا کہ دین کے ساتھ یہ اشہزاء کیوں ہو رہا ہے۔ یہ کچھ ملوکیت کے لیے مفید ہوتا ہے۔

ملوکیت کی، مذہبی پیشوائیت کو تلقین ہی نہیں، حکم ہوتا ہے کہ ـــــ ''مست رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں اسے''ـــــ اور مذہبی پیشوائیت یہ کہہ کر عوام کو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں مست رکھتی ہے کہ اس سے ثواب ہوتا ہے۔ دین، ہرقیصر اور ہر کسریٰ کا تختہ اُلٹ کر دنیا کو دکھا دیتا ہے کہ ثواب اسے کہتے ہیں، اور مذہب میں عرفات کے میدان میں لاکھوں حاجی، رو رو کر دعائیں مانگتے ہیں کہ ''یا اللہ! اسرائیل کا بیڑا غرق ہو۔ تُو اس مغضوب علیہ قوم کو تباہ و برباد کر دے۔'' یہ دعائیں مانگ کر وہ مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے فریضۂ حج ادا کر دیا۔ معلم انہیں مبارک باد دیتے ہیں کہ ''اللہ نے تمہارا حج قبول کر لیا۔ اس کے ثواب کے صلہ میں، ایسے کئی حج تمہارے نصیب ہوں (تاکہ ہماری دنیا اور تمہاری عاقبت سنور جائے!)'' وہ مبارک بادیوں کے ان غلغلوں اور طنطنوں کے ساتھ وطن لوٹتے ہیں، اور دوسری طرف ؎

آتی ہے دمِ صبح صدا عرشِ بریں سے — کھویا گیا کس طرح ترا جوہرِ ادراک؟
کس طرح ہوا کند ترا نشترِ تحقیق؟ — ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک
مہر و مہ و انجم نہیں محکوم ترے کیوں — کیوں تیری نگاہوں سے لرزتے نہیں افلاک
باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری! — اے کشتۂ سلطانی و مُلّائی و پیری!

(ارمغانِ حجاز، ص 247)

یاد رکھئے! جس قدر کوئی قوم مذہبی عقائد میں پختہ اور مذہبی ارکان کی ادائیگی کی پابند ہوتی ہے، اتنی ہی وہ دین سے دور اور اس سے برگشتہ رہتی ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے الدین کو پیش کیا تو قریش کی طرف سے بھی اس کی مخالفت ہوئی اور اہل کتاب (یہود اور نصاریٰ) کی طرف سے بھی۔ قریش کی مخالفت دنیاوی مصلحت کوشیوں کی بنا پر تھی، اس لیے وہ ایک وقت پر جا کر ختم ہو گئی اور انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ان کے برعکس، اہل کتاب کی مخالفت مذہب کی بنا پر تھی۔ وہ کہتے تھے کہ آپ جن عقائد اور احکام کے اختیار کرنے کی دعوت دیتے ہیں انہیں ہم پہلے سے تسلیم کرتے ہیں ـــــ ہم خدا، وحی، ملائکہ، انبیاءؑ، آخرت پر ایمان رکھنے، اور نماز، روزہ، حج، خیرات کے قائل ہیں۔ پھر آپ ﷺ کا ہم سے مطالبہ کیا ہے؟ یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ وہ ''مذہب'' کے عقائد و ارکان کے پابند ہیں، اور حضور ﷺ کی دعوت الدین کی ہے۔

ہم (مسلمانانِ عالم) بھی اہلِ کتاب کی سطح پر ہیں اور ''مذہب'' میں مگن۔ اقوام مغرب کا مفاد اسی میں ہے کہ ہم اسی میں مگن رہیں۔ چنانچہ یہ جو ہم اس وقت ساری دنیا میں ''احیاء اسلام'' کی تحریکوں کو سرگرم عمل دیکھ رہے ہیں تو یہ انہی مغربی اقوام کی سازش کا نتیجہ ہیں۔ علامہ اقبالؒ بہت پہلے ہمیں اس سے متنبہ کر گئے تھے۔ خدا توفیق دے تو آپ ارمغانِ حجاز میں ان کی نظم ـــــ ابلیس کی مجلسِ شوریٰ ـــــ کا بغائر مطالعہ کریں۔ یہ سازش بے نقاب ہو کر سامنے آجائے گی۔

عارف محمود کسانہ، سویڈن
arifkisana@gmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بچوں کا صفحہ

آدم اور فرشتوں کی کہانی

چھٹی کا دِن تھا اور موسم بھی بہت خوشگوار تھا۔ حارث بہت خوش تھا کیونکہ وہ آج اپنے گھر والوں کے ساتھ تفریح کے لیے جھیل کے کنارے آیا ہوا تھا۔ بہت لوگ وہاں آئے ہوئے تھے اور سب خوشگوار موڈ میں تھے۔ بچے پارک میں کھیل رہے تھے اور کچھ لوگ گپ شپ لگا رہے تھے۔ حارث کی امی نے پکنک کے لیے کھانے پینے کی چیزیں تیار کی تھیں۔ حارث اپنے ابو کے ساتھ جھیل کے کنارے بطخوں اور دوسرے آبی پرندوں کو روٹی کے ٹکڑے ڈال رہے تھا اور بہت سے پرندے وہاں جمع ہو گئے تھے۔ چھوٹا ہاشم بھی ساتھ ہی کھیل رہا تھا۔ امی نے اُسے کہا کہ پانی کی طرف نہ جانا لیکن وہ تو بہت شرارتی تھا اور امی کے منع کرنے کے باوجود پانی کی طرف بھاگا۔ اِس پر ابو نے کہا حارث دوڑ کر جاؤ اور ہاشم کو پکڑو کہیں وہ پانی میں نہ گر جائے۔ حارث نے اُسے جا کر روکا اور پکڑ کر امی کے پاس لے آیا۔ ابو بھی وہیں آ گئے اور امی نے سب کو چاٹ ڈال کر دی اور وہ مزے سے کھانے لگے۔

حارث نے ابو سے کہا ابو آپ سے ایک سوال پوچھنا ہے وہ یہ کہ آدم اللہ تعالیٰ کے منع کرنے کے باوجود جب پھل کھانے کے لیے جانے لگے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں روکا کیوں نہیں یا کسی فرشتے کے ذریعہ انہیں ایسا کرنے سے کیوں نہیں بچایا۔ ابو کہنے لگے واقعی یہ تو بہت ہی اہم سوال ہے۔ بیٹا جب اللہ نے آدم کو بنایا تو اُس میں یہ صلاحیت بھی رکھ دی تھی کہ اپنی مرضی اختیار کر سکے۔ اُسے دونوں راستے بتا دیے، درست بھی اور غلط بھی اور اُسے مکمل اختیار دیا کہ جو راستہ وہ چاہے اُس پر چلے۔ یہی انسان اور باقی ساری مخلوق میں فرق ہے۔ اللہ کی پیدا کی ہوئی تمام مخلوق چاہے چرند پرند ہوں یا فرشتے، چاند سورج اور سیارے ہوں یا کوئی بھی اور سب خدا کے بنائے ہوئے قانون کے تحت چلتے ہیں اور کسی میں ذرہ برابر اِدھر اُدھر ہونے کی نہ ہی صلاحیت ہے اور نہ ہی وہ ایسا کر سکتے ہیں۔ سورج چاند اپنے اپنے راستے پر مسلسل گردش میں ہیں اور اُن کی رفتار میں ایک لمحے کا بھی فرق نہیں ہوتا۔ تمام جانور بھی اپنی اپنی فطرت کے مطابق رہتے ہیں اور کبھی بھی اُس کے خلاف نہیں جاتے۔ شیر جتنا بھی بھوکا ہو جائے لیکن گھاس نہیں کھائے گا اِسی طرح بکری گوشت کی طرف منہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گی۔ کائنات کی تمام مخلوق کے برعکس اللہ تعالیٰ نے آدم کو اختیار دے رکھا ہے کہ وہ جو چاہے وہ کرے یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کے خلاف بھی چل سکتا ہے اور اسی اختیار کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آدم کو نہیں روکا تھا۔ انسان کو خدا نے شعور دیا ہے جبکہ دیگر جانداروں میں یہ صفت نہیں ہے۔ اللہ نے آدم کو اچھے اور بُرے کی صلاحیت دے دی جبکہ باقی مخلوق میں ایسا نہیں ہے۔ بکری کو جب بھوک لگتی ہے وہ نہیں دیکھتی کہ یہ اُس کے مالک کا کھیت ہے یا کسی اور کا، وہ اپنا پیٹ بھر لیتی ہے۔ شیر جب شکار کرتا ہے وہ نہیں دیکھتا کہ چھوٹا جانور ہے یا بڑا، وہ اپنی بھوک مٹانے کے لیے حملہ آور ہو جاتا ہے۔

حارث: جی ابو میں نے ایک دفعہ ٹیلی وژن میں دیکھا تھا کہ ایک بڑا سا شیر ہرن کے چھوٹے سے بچے کو پکڑ رہا تھا۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا اِس لیے میں نے ٹیلی وژن ہی بند کر دیا تھا۔ لیکن ابو جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو بتایا کہ میں آدم کو بنا رہا ہوں تو انہوں نے اعتراض بھی تو کیا تھا۔ فرشتوں نے ایسا کیوں کیا۔

ابو: تم نے بالکل درست کہا ہے اور یہ قرآن مجید میں بھی ہے۔ فرشتوں کو اِس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ ایک ایسی مخلوق بنائی جا رہی ہے جس کے پاس خدا کے حکم اور قانون کے خلاف کام کرنے کی بھی صلاحیت ہوگی۔ اِس بنا پر انہوں نے کہا کہ ایسی مخلوق جس کے پاس اِس طرح کا اختیار ہوگا وہ تو فساد بھی پھیلا سکتی ہے کیونکہ فرشتے اور خدا کی باقی ساری مخلوق تو خدا کے حکم کے خلاف نہیں جا سکتیں۔ لیکن اللہ نے کہا جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے اور یہ بالکل درست ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ تو تمام چیزوں کا پیدا کرنے والا ہے اور فرشتوں کو بھی اُسی نے پیدا کیا ہے لہذا فرشتے کیسے اللہ سے بہتر جان سکتے تھے۔

حارث: لیکن ابو جان بعد میں فرشتوں نے آدم کو سجدہ کیوں کیا تھا۔

ابو جان: اللہ تعالیٰ نے جب آدم کو پیدا کیا تو اُس میں یہ صلاحیت بھی رکھ دی کہ وہ علم حاصل کر سکے اور کائنات کی چیزوں کے نام جان سکے۔ آدم نے اللہ کی دی ہوئی اس صلاحیت سے فائدہ اُٹھایا اور اپنے اردگرد کی چیزوں کے نام جان لیے۔ فرشتوں میں یہ صلاحیت نہیں تھی اِس لیے وہ کائنات کی چیزوں کے بارے میں کچھ بھی نہ جانتے تھے۔ اب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو پوچھا کہ اِن چیزوں کے نام بتاؤ لیکن انہوں نے کہا کہ ہمیں تو معلوم نہیں، ہم کیسے بتا سکتے ہیں۔ اللہ نے آدم سے پوچھا تو آدم نے تمام چیزوں کے نام بتا دیے اِس پر فرشتوں سے اللہ تعالیٰ نے کہا کہ جو میں جانتا ہوں تم نہیں جان سکتے۔ اِسی برتری کی وجہ سے اللہ نے فرشتوں سے کہا کہ وہ آدم کے سامنے جھک جائیں تو سب نے آدم کو سجدہ کیا گویا اِس طرح کائنات کی تمام قوتیں انسان کے سامنے جھک گئیں جس کی طرف قرآنِ حکیم نے واضح طور پر کہا ہے کہ کائنات کی تمام چیزیں انسان کی دسترس میں ہیں۔ جب سب فرشتوں نے انسان کو سجدہ کیا اُس وقت ابلیس یعنی شیطان نے انکار کر دیا اور وہ اکڑ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے کہا تو اب میرا نافرمان ہے۔ ابلیس نے یہ کہا کہ وہ آدم کی نسل کو بہکانے اور غلط رستے پر چلانے کی کوشش کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ میرے نیک لوگوں پر تیرا کوئی اثر نہیں ہوگا۔

حارث: ابو اور بتائیں اس کے بعد کیا ہوا۔

ابو جان: آدم اپنی بیوی کے ساتھ خوش و خرم رہ رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں کہا جہاں سے جو مرضی ہو کھائیں مگر ایک خاص درخت تھا اُس کے قریب نہ جائیں یعنی انہیں آپس میں اختلاف کرنے سے منع کیا۔ مگر ابلیس نے دونوں سے وہی کرایا جس سے اللہ نے روکا تھا۔ بعد میں انہیں احساس اور افسوس ہوا کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا۔ دونوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور اللہ سے توبہ کی اور معافی مانگی۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی توبہ کو قبول کر لیا۔ ہمیں بھی چاہیے جب بھی کوئی غلطی ہو تو اُس کو تسلیم کر لینا چاہیے اور فوراً توبہ کرنی چاہیے اور پھر دوبارہ ویسی غلطی نہیں کرنی چاہیے۔ اتنی دیر میں حارث کا دوست علی آ گیا اور وہ دونوں ساتھ ہی بنے پارک میں کھیلنے چلے گئے۔

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اسلامی نظام کی معاشی قدریں

قرآنِ کریم کی عطا کردہ مستقل اقدار پر جو نظام قائم ہوتا ہے وہ پوری انسانیت کے لیے امن وسلامتی کا گہوارہ ہوتا ہے (2:38، 3:97) قرآنِ کریم کی ان اقدار میں سے ایک بنیادی قدر عدل قائم کرنا بھی ہے اور مسلمانوں کا یہ ایک اہم ترین فریضہ ہے کہ وہ ساری دنیا میں عدل قائم رکھیں فرمایا اِعۡدِلُوۡا ۟ ہُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی ۫ (5:8) عدل قائم رکھو کہ یہ تقویٰ کے قریب ہے سورہ نساء میں ارشادِ عالی ہے کہ جنگ میں بھی دشمن پر زیادتی نہ کرو، وَقَاتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَکُمۡ وَلَا تَعۡتَدُوۡا ؕ (2:190)، ترجمہ: جو لوگ تم سے لڑتے ہیں تم بھی اللہ کی راہ میں جہاد کرو اور کسی پر زیادتی نہ کرو حضرت علیؓ نے فرمایا الملك يبقى مع الكفر ولا يبقى مع الظلم ۔ حکومتیں کفر کرنے سے تو شاید رہ سکتی ہے، لیکن ظالم حکومت کو دوام نہیں مل سکتا۔ لیکن یہ بات بھی بخوبی واضح رہے کہ قرآنِ کریم صرف قرآن کے مطابق عدل کرنے کو عدل گردانتا ہے انسانوں کے وضع کردہ قوانین کے مطابق عدل کرنے کو قرآن عدل نہیں سمجھتا۔ اُس کا واضح فیصلہ ہے وَمِمَّنۡ خَلَقۡنَاۤ اُمَّۃٌ یَّہۡدُوۡنَ بِالۡحَقِّ وَبِہٖ یَعۡدِلُوۡنَ ﴿۱۸۱﴾ (7:181) ہمارے پیدا کردہ وہ لوگ ہیں جو حق کے ساتھ دوسروں کی راہنمائی کرتے ہیں اور اسی کے ذریعے عدل قائم رکھتے ہیں۔ الحق قرآن ہی کا دوسرا نام ہے اور اسی کے مطابق فیصلہ کرنے کو عدل کہا جاتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ قرآن کریم اپنے علاوہ کسی قانون کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ اس کا واضح موقف یہ ہے کہ انسانوں کے وضع کردہ تمام قوانین کفر، ظلم اور فسق پر مبنی ہوتے ہیں، اور جو مملکت انسانوں کے وضع کردہ قوانین پر عمل درآمد کرتی ہے۔ تو اس مملکت میں کفر، ظلم اور فسق کا رواج ہوتا ہے اور ہر شخص کفر، ظلم اور فسق کا مرتکب ہوتا ہے۔ ارشادِ عالی ہے وَمَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ (5:44) ''جو لوگ اللہ کی نازل کردہ (کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔) یعنی کفر اور اسلام میں امتیاز ہے جس کی رُو سے یہ متعین ہوسکتا ہے کہ کون سی مملکت اسلامی ہے اور کون سی اسلامی نہیں ہے۔ قرآنِ کریم نے انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو نہ صرف کفر پر مبنی قرار دیا ہے بلکہ اس کا ارشاد ہے کہ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین ظلم وفسق پر بھی مبنی ہوتے ہیں (5:45، 5:43) سورۃ مائدہ کی ان تین آیات کریمات نے ان انسانوں کے لیے جو قرآن کو نظر انداز کرکے، اپنے لیے خود قوانین وضع کرتے ہیں، تین حکم صادر فرمائے ہیں۔ پہلا حکم یہ ہے کہ وہ کافر ہیں (5:44)، دوسرے یہ کہ وہ ظالم ہیں (5:45) اور تیسرے یہ کہ وہ فاسق ہیں (5:47)۔ اب ہم قرآن کریم کے عائد کردہ ان تینوں احکام کی وضاحت کرتے ہیں، کہ جو انسان خدا کے احکامات کو چھوڑ کر، انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین پر عمل کرتا ہے حقیقت یہ ہے کہ وہ ان تین جرائم

کا مرتکب ہوتا ہے۔ اولاً اس کا پہلا جرم تو یہ ہے کہ اس کا یہ فعل احکامِ خداوندی کے انکار کا ہم معنی ہوتا ہے اور یہی کفر کہلاتا ہے۔ اس کا دوسرا جرم یہ ہے کہ اس کا یہ فعل عدل وانصاف کے خلاف ہے کیونکہ بالکل عدل کے مطابق جو حکم ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے کیونکہ یہ اس ذاتِ باری تعالیٰ کا بنایا ہوا ہے اس لیے جو حکم بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہٹ کر بنایا جائے گا وہ لازماً ظلم پر مبنی ہوگا اور انسان کا تیسرا جرم یہ ہے کہ اس کا بندہ ہونے کے باوجود، جب اس نے اپنے خالق کے قانون سے انحراف کر کے، اپنا قانون خود وضع کیا ہے تو وہ اللہ کی بندگی اور اس کی اطاعت کے دائرہ سے باہر ہو گیا اور یہی فسق ہے کفر، ظلم اور فسق اپنی نوعیت کے اعتبار سے لازماً اللہ تعالیٰ کے قوانین سے بغاوت اور سرکشی ہے۔

اصل یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے انسانوں کو قانون وضع کرنے کا اختیار ہی نہیں دیا۔ اس کے ارشاد گرامی کے مطابق قانون بنانے کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ (6:57) حکم صرف اللہ کے لیے ہے اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۣ (6:63) جان لو حکم صرف اللہ کے لیے ہے نیز (12:40، 12:67، 28:70، 28:88) اور اوّل دن سے یہ قوانین انسانیت کو فراہم کر دیئے گئے تھے۔ انبیاء کرام یہ قانون لے کر آتے تھے اور ان قوانین کو جاری کرنا ان کے فرائض میں شامل تھا۔ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ (57:25) ترجمہ: ہم نے یقیناً اپنے پیغمبروں کو واضح اور روشن دلائل دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور ترازو نازل کی تا کہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسانیت پر رحم وکرم فرما کر رسولوں کا سلسلہ جاری کیا (3:164) ان کے ذریعے اپنے قوانین واحکامات مسلسل انسانیت کو عطا فرمائے، اور انبیاء کرامؑ کو حکم دیا کہ ان کے مطابق فیصلے کریں۔ انبیاء کرامؑ نے ہر شخص کو آگاہ کیا کہ یہ وہ قوانین ہیں جن کے مطابق انسانیت کو چلنا ہے اور ان قوانین کے بنانے میں کسی انسان کو کوئی دخل نہیں ہے تو انسان کی انسان پر حکومت تو یہاں ہی ختم ہوگئی۔ جب کوئی انسان قانون ہی نہیں بنا سکتا، تو انسانوں کا اقتدار انسانوں پر ختم ہو گیا۔ نہ کوئی فرد یا گروہ قانون بنا سکتا ہے اور نہ ہی ان کی حکومت قائم ہو سکتی ہے۔ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ انسانوں پر حکومت کرے۔ یہ کسی نبی کے بھی حق میں نہیں ہے کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کی محکومیت اختیار نہ کرو بلکہ میری محکومیت اختیار کرو (3:79)۔

قرآنِ کریم نے انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو جو ظلم پر مبنی قرار دیا ہے یہ کوئی نظری یا Academic بحث نہیں ہے آپ خود اندازہ فرمائیں کہ آج ساری دنیا کی کیا حالت ہے۔ گذشتہ دو تین صدیاں Colonization کا دور تھا۔ اِس دور میں چند ممالک نے ساری دنیا پر قبضہ کر رکھا تھا۔ برصغیر ہندو پاک پر جس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی نے آہستہ آہستہ قبضہ کیا وہ سب ظلم پر مبنی قوانین کے ذریعے کیا تھا۔ جب اس برصغیر میں برٹش دور شروع ہوا اس دن سے 1947ء تک اس برصغیر میں جو دولت ہوتی تھی وہ برٹش گورنمنٹ سب انگلستان بھیج دیتی تھی اور یہاں کی مخلوق بھوک اور غربت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس دور میں سالانہ بجٹ Discuss نہیں ہوتا تھا، جو بجٹ حکومت بناتی تھی اس پر عمل ہوتا تھا اور سارا خام مال بھی انگلستان بھیج دیا جاتا تھا اور اس خام مال سے تیار شدہ مال، مختلف اشیاء برصغیر لا کر فروخت ہوتی تھیں۔ یہی غربت اور کسمپرسی کا حال دوسرے مفتوح

ممالک کا تھا۔ خود انگلستان میں جہاں یہ ساری دولت سمٹ کے چلی جاتی تھی زیادہ بڑا طبقہ غریبوں پر مشتمل تھا۔ آپ Charles Dickens کے ناول پڑھیں اس نے اپنے دور کے معاشرہ کی عکاسی کی ہے۔ اس کے ناول پڑھنے سے دل دُکھتا ہے۔ انگریز بہ حیثیت انگلستان کے باشندے ہونے کی وجہ سے بُرے نہیں ہیں۔ ان کے غریب بھی ہمارے غریب کی طرح مظلوم ومحروم ہیں ان کا غریب طبقہ ہمارے جیسا طبقہ ہے، اصل عیب اور اصل وجہ یہ تھی کہ وہ نظام ظلم پر مبنی قوانین پر استوار تھا۔

آج کی بین الاقوامی صورتحال ملاحظہ فرمائیں۔ دنیا کے کسی کونے میں امن وسلامتی نہیں ہے۔ سارا مشرق آگ میں جل رہا ہے۔ قرآن نے ان قوانین کا نتیجہ فرمایا تھا کہ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (30:41) پوری دنیا کے اندر فساد سا برپا ہو گیا ہے۔ اس کا سبب خود قرآن بیان کرتا ہے کہ اس کا سبب یہ ہے کہ انسان خود غلط قوانین اور غلط نظام بناتا ہے، جس سے ساری دنیا میں فساد پھیل جاتا ہے۔ بھارت میں بیس کروڑ، دلت اور بیس کروڑ مسلمان رہ رہے ہیں۔ انہیں ایک دن کی سیکورٹی نہیں ہے۔ چند روز پیشتر گجرات میں چار دلتوں کو اس قدر کوڑے مارے گئے کہ وہ چاروں مرنے کے قریب ہو گئے تھے۔ ان کا جرم یہ تھا کہ انہوں نے مردہ گائے کی کھال فروخت کی تھی۔ مردہ جانور کی وجہ سے زندہ غریبوں کو مارنا، یہ قانون کی خامی ہے۔ بھارت کے وزیر اعلیٰ مودی کو ساری دنیا نے دہشت گرد قرار دیا تھا اور ان کی سخت مذمت کی گئی تھی اور امریکہ اور چند ممالک نے انہیں ویزا تک نہیں دیا تھا لیکن ان کے وزیر اعظم ہونے کے بعد ان کو امریکہ نے ویزا بھی دیا اور ان کا Red Carpet استقبال کیا گیا۔

اصل یہ ہے کہ باطل پر بنائے ہوئے نظام کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس میں فساد ہی فساد ہو۔ یہ اس نظام کی خامی ہے کہ ایک آدمی پیدا ہوا، ساری زندگی گزاری اور فوت ہو گیا، اور اس کی زندگی ختم ہو گئی۔ جانوروں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ جانور پیدا ہوا، اور اپنی زندگی گزار کے مر گیا۔ یہ زندگی حیوانی سطح کی ہے۔ ساری دنیا میں سیکولر ملکوں میں جن میں زندگی کا حیوانی تصور ہے کہ انسان پیدا ہوا، زندگی بسر کی اور اس کے بعد مر گیا اور زندگی ختم ہو گئی۔ اگر آپ زندگی کا خاتمہ اس طرح تسلیم کر لیتے ہیں، جیسا کہ سیکولر سٹیٹز میں ہوتا ہے، تو پھر کسی مستقل قدر Permanent Values کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ انسانیت کے کسی شرف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جس نے جتنا چھین لیا، جھپٹ لیا وہ اُس کا ہے۔ سیکولر نظام میں حرام مال جمع کرنا اور دوسروں کی کمائی کو چھین لینا، دوسروں کو بھوکا مار دینا، محتاج کرنا، محکوم بنانا۔ یہ سارا تصور اس لئے ہے کہ زندگی کا نظریہ یہ ہے کہ زندگی مرنے کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ زندگی کا قرآنی تصور یہ ہے کہ انسان کے مرنے کے بعد بھی زندگی باقی رہتی ہے، جسم پر موت وارد ہوتی ہے۔ لیکن جسے انسان کہا جاتا ہے وہ زندہ ہے باقی ہے۔ یہ تصورِ حیات کہ انسان یہاں جو کچھ کرتا ہے، اس کے نتائج مرنے کے بعد بھگتنے ہیں، یہ عقیدہ انسان کو ارتکاب جرائم سے روکتا ہے۔ قرآنی نظام کی یہ ایک مستقل قدر ہے کہ کسی دوسرے کی محنت کا استحصال کرنا جرم ہے، اس کا مواخذہ خدا کے ہاں ہوگا۔ افراد کا ایک ایک کر کے اور مملکت کا اس کی اپنی سطح پر۔

ہمارے ہاں آج کل پانامہ لیکز (Panama Leaks) کا بڑا چرچہ ہے۔ یہ مسئلہ ساری دنیا کے ممالک کو درپیش ہے۔

ہمارے ہاں بھی چند سو افراد اس مسئلہ کی گرفت میں آئے ہوئے ہیں۔ بحث یہ ہو رہی ہے کہ یہ آف شور کمپنیاں قانون کے مطابق بنائی گئی ہیں یا یہ خلافِ قانون ہیں۔ کوشش یہ ہو رہی ہے کہ ایسے قوانین ہی کیوں نہ بنا دیئے جائیں جس سے یہ کمپنیاں جائز قرار دی جا سکیں ظاہر ہے کہ کوئی بھی قانون بنانا مشکل نہیں ہے خصوصاً اس وقت جب کہ قانون بنانے کا اختیار ہی ان لوگوں کے پاس ہو جو خود کمپنیوں کے مالک ہوں۔ اس طرح انسانوں کے وضع کردہ قوانین کی حیثیت آپ خود ملاحظہ کر لیں۔ قرآنِ کریم کے نزدیک یہ مسئلہ ہی سطحی ہے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے اصل جرم یہ ہے کہ جب ملک میں اس درجہ غربت و افلاس ہے، اور یہاں کے لوگ دو وقت کی روٹی کو ترس رہے ہیں، تو دولت کے یہ انبار جمع کرنا سب سے بڑا جرم ہے۔ خواہ آپ خود کوئی بھی قانون وضع کر لیں قرآن کے نزدیک عوام کی Cost پر دولت کا انبار جمع کرنا جرم ہے اور ہزار قوانین وضع کرنے کے بعد بھی آپ اِس جرم کی سزا سے بچ نہیں سکتے۔

ان پانامہ لیکز کے علاوہ بھی ہمارے ہاں آج کل چاروں طرف کرپشن کی آگ لگی ہوئی ہے اور ہر شخص کرپشن کے عام ہونے کا اعتراف کر رہا ہے۔ لیکن ہر شخص اپنی اپنی پارٹیوں کو بری قرار دے رہا ہے۔ اس میں حکمرانوں کو بھی لپیٹ میں لیا جا رہا ہے۔ لیکن کچھ لوگ حکمرانوں کو بری ٹھہرا رہے ہیں۔ مسئلہ صرف حکمران کی Involvment کا نہیں ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ملک میں کرپشن ہے کیوں۔ ملک میں کرپشن کے عام ہونے کے ذمہ دار ہی حکمران ہیں اگر حکومت کی نگرانی اور گرفت مضبوط ہے تو ملک میں کرپشن نہیں ہو سکتی حکمرانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ملک میں کرپشن کو ختم کریں۔

جس طرح سابقہ انبیاء کرامؑ اپنے اپنے ساتھ ایک الٰہی نظام لیکر آتے تھے اور اس نظام کو جاری کرتے تھے اور اس کو دوسرے غیر خدائی نظاموں پر غالب کرتے تھے (61:14) اسی طرح حضور ﷺ نے بھی اپنے دور میں اسلامی نظام قائم فرمایا تھا جو دس لاکھ مربع میل پر وسیع و عریض تھا۔ چونکہ یہ مملکت بہت وسیع تھی اور تن تنہا فرد اس کو جاری نہیں رکھ سکتا تھا اس لیے حضور ﷺ نے مقامی حکام مقرر فرما دیے تھے جن کو قرآنِ کریم نے اولوالامر کے نام سے موسوم کیا ہے اور قرآنِ کریم نے ان مقامی حکام، یعنی اولوالامر کی اطاعت کو فرض قرار دیا ہے۔ جو لوگ مدینے سے دور بستیوں میں آباد تھے وہ مقامی حکام سے اپنے مقدمات طے کرا لیتے تھے اور ان کی اطاعت کرنے سے رسول اللہؐ کی اطاعت ہو جاتی تھی۔ اولوالامر کی اطاعت کو فرض قرار دینا ایک بہت اہم اور انقلابی بات تھی جس کا ہمارے علماء نے صحیح اندازہ نہیں کیا۔ اولوالامر کی اطاعت کے فرض ہونے سے چار نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اس کا پہلا نتیجہ تو یہ نکلتا ہے کہ اولوالامر کی اطاعت کی فرضیت سے ایک نظام کی شکل خود بخود سامنے آ جاتی ہے، اور ایک باضابطہ نظام متشکل ہو جاتا ہے اور انسانیت ایک باضابطہ نظام کے تصور سے آگاہ اور باخبر ہوتی ہے دوسرا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نظام کی اطاعت کی وجہ سے انفرادی اطاعت کا تصور ختم ہو گیا، اور فرد واحد کی حکومت تصور ختم ہو گیا اور قرآنِ کریم نے انسان پر انسان کی حکومت کو حرام اور شرک قرار دے دیا۔ اس فرضیت کا تیسرا نتیجہ یہ نکلا کہ ذاتی اطاعت کا تصور بھی ختم ہو گیا اور چوتھی اہم بات یہ ہے کہ چونکہ اسلامی نظام کی اطاعت عبادتِ خداوندی ہوتی ہے، اس لیے پرستش کے

تصور کی بھی جڑ کٹ گئی۔ قرآنِ کریم نے پرستش کو ختم کر کے اطاعت کو فرض قرار دیا ہے۔ اسلامی نظام کی برکات تو بہت ہیں ان میں سے ایک برکت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جو وعدے انسانیت سے کئے ہیں اللہ کے وہ وعدے قرآنی نظام کے ذریعے پورے ہوتے ہیں (22:40،47:7) اسی طرح دعائیں بھی نظام کے ذریعے پوری ہوتی ہے۔ (58:1،27:62) حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ جب اسلامی مملکت کے باشندے اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرتے ہیں تو وہ ایک طرح سے میری شکایت ہوتی ہے میں اس مقام پر اس لئے بیٹھا ہوں کہ تمہاری دعائیں اللہ تک جانے سے روک دوں۔

قرآنِ کریم کا تصور زندگی یہ ہے اور جسے ہر مسلمان تسلیم کرتا ہے اور جس پر ہر مسلمان ایمان لاتا ہے کہ انسان صرف طبعی جسم سے عبارت نہیں ہے بلکہ جسم کے علاوہ نفس یا ذات بھی اس کے ساتھ ہوتی ہے اور اس طرح ایک انسان جسم اور ذات کا مرکب ہوتا ہے یہ ذات ایک الوہیاتی توانائی ہے جو اس کو حیوانیت سے ممیز کرتی ہے۔ اس توانائی (ذات) کو نشوونما دینا اصل مقصد حیات ہے۔ یہ ذات یا نفس ہی اسلامی مملکت کی بنیاد ہوتی ہے یہ وہ بنیاد ہے جس پر دین کی ساری عمارت قائم ہوتی ہے۔ اس تصورِ حیات کے مطابق موت آنے پر جسم انسانی تو ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن جسے انسان کہا جاتا ہے وہ اس موت کے بعد بھی زندہ رہتا ہے اور جو کچھ اس نے یہاں دنیا میں کیا ہوتا ہے، آخرت میں اُسے اس کے نتائج Face کرنے ہوتے ہیں۔ سیکولر ریاستیں اِسی نفس انسانی کو نہیں مانتیں اور اس کی منکر ہوتی ہے۔ وہ ریاستیں قرآن کے مطابق تو انسانیت کے Level تک نہیں پہنچتیں، وہ صرف حیوانیت کی سطح پر ہی رُک جاتی ہیں۔ وہ مرنے کے بعد کسی کو جوابدہی کی قائل نہیں ہوتیں، اس لئے وہ یہاں پر کام کرنے میں آزاد ہوتی ہیں۔ ان میں صرف سوسائٹی کے قوانین کی پابندی ضروری خیال کی جاتی ہے۔

نفس انسانی کی تربیت مستقل اقدار پر عمل کرنے سے ہوتی ہے نفس انسانی کی تربیت کے اصول وقوانین قرآنِ کریم نے خود مقرر فرمائے ہیں۔ اسلامی مملکت جن معاشی اقدار پر استوار ہوتی ہے، اور جن پر عمل کرنے سے نفس انسانی کی نشوونما ہوتی ہے، وہ معاشی اقدار قرآنِ کریم نے تشریح سے بیان کی ہیں ہم آپ کی خدمت عالی میں قرآنِ کریم کے وہ معاشی اقدار پیش کرتے ہیں۔ جن پر ہمارے لیڈروں کو سب سے پہلے عمل کرنا چاہئے۔

(1) قرآنِ کریم کی اقدار میں سے دو اقدار تو ایسی اہم اور ابدی وسرمدی ہیں کہ اگر ان پر ہی ڈھانچہ کھڑا ہو جائے تو پورے معاشرہ سے استحصال، کرپشن اور Exploitation ختم ہو سکتی ہے ارشاد ہے اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۙ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۙ (53:38-39) ترجمہ: کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا اور یہ کہ ہر آدمی صرف اسی کا حقدار ہے جو اس نے کمایا۔ حلال وطیب صرف وہ ہے جو انسان کی محنت کی کمائی ہے، جو محنت کی کمائی نہیں، بلکہ سرمائے کے عوض حاصل ہوا ہے وہ قرآنِ کریم کے نزدیک رِبوٰ ہے جس کی تفصیل خود قرآنِ کریم بیان فرماتا ہے۔ یہ جو فرمایا کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا تو یہی الفاظ سورہ فاطر میں بھی آتے ہیں۔ یہاں پھر وہی بات دہرائی گئی ہے کہ اپنا بوجھ خود ہی اُٹھانا ہوتا ہے۔ ہر باطل نظام میں یہ ہوتا ہے کہ خود اپنا بوجھ نہیں اٹھاتے اور سارا بوجھ دوسروں پر ڈال دیتے ہیں۔ لیکن اسلامی نظام

کی تو بنیاد ہی مکافاتِ عمل کے عقیدے پر ہوتی ہے۔ اس میں تو کوئی شخص دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔

ہم نے لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (53:39) کا جو قرآنی اصول آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔ ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ علماء کرام کے موقف سے بھی آپ کو آگاہ کر دیں تا کہ کوئی بات آپ سے مخفی نہ رہے اور یہی دیانتداری کا تقاضہ ہے۔ ہمارے مفسرین کی یہ عادت مستمرہ ہے کہ یہ حضرات قرآنِ کریم کی وہ آیات جو مسلمانوں کے غلبہ سے متعلق ہیں، یا اسلامی نظام سے متعلق ہیں، یا اس دنیا میں بہترین معاشرہ قائم کرنے کے متعلق ہیں، وہ ایسی تمام آیات کو قیامت کے ساتھ جوڑ دیتے ہیں، اور ایسی آیات کا اس دنیا سے کوئی تعلق باقی نہیں رہنے دیتے۔ ہم اس قسم کی آیات کی قرآنی و دینی تفسیر پیش کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اس آیت کے متعلق بھی تقریباً تمام مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ اس آیت کا تعلق قیامت سے ہے۔ لیکن یہ ہمارے علماء کرام کی ایک کوتاہ نگاہی ہے اور اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ ان حضرات کے پیش نظر مذہب ہے، اور ان کے سامنے دین کا تصور ہے ہی نہیں۔ یہ بات کہ اس آیت کا تعلق اس دنیا سے ہے، اور یہ بات کہ اس اصول کا اطلاق بھی یہاں ہی ہونا چاہئے، اس سے اگلی آیت سے واضح ہو جاتا ہے جس میں فرمایا وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى (53:40) ترجمہ: اور یہ کہ اس کی کمائی اس کو دکھلانی ضرور ہے (ترجمہ حضرت شیخ الہند) مولانا اصلاحی نے اس کا ترجمہ تحریر کیا ہے ''اس کی کمائی عنقریب ملاحظہ کی جائے گی''۔ حضرت مولانا اصلاحی نے سوف کے معنی عنقریب کے کئے ہیں، اور اس کا قیامت سے تعلق نہیں رکھا۔ لیکن شیخ الہند نے سَوْفَ کا ترجمہ عنقریب، ترجمہ میں شامل نہیں کیا۔

اس ابدی اصول کے متعلق کہ ہر شخص کے لئے وہی ہے جو اس نے کمایا ہے قرآنِ کریم فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ ؑ کو حکم دیا کہ فرعون کی طرف جاؤ، اور ایک انقلاب برپا کرو اور اس انقلاب کو برپا کرنے کی وجہ یہ بتائی تا کہ لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى (20:15)، یہاں خود وہی تسعی کا لفظ دھرا دیا تا کہ ''ہر شخص کو اس کی محنت کا معاوضہ مل سکے۔'' یہ تھا وہ انقلاب، یہ قیامت کی بات نہیں ہو رہی ہے۔ یہ اس معاشرہ کا ایک معاشی اصول بیان کیا جا رہا ہے۔

(2) قرآنِ کریم کا نظام کہیں خارج سے Impose نہیں ہوتا۔ یہ نظام مسلمانوں کی کامل رضامندی، خوشی و رغبت کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد ایمان اور اعمال صالحہ پر ہوتی ہے۔ بلکہ ایمان و اعمال صالحہ کا لازمی نتیجہ بہترین نظام کی شکل میں نمودار ہوتا ہے (24:55) انسان کی خارجی تبدیلی کا انحصار اس کی داخلی تبدیلی پر ہوتا ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ (13:11)، یہ بھی قرآنِ کریم کی ایک مستقل قدر ہے اسلامی نظام کی بنیاد نفس انسانی کے تصور پر ہوتی ہے اور اس نفس کا نشوونما کرنا اس نظام کا فرض ہوتا ہے۔ نفس کی نشوونما کا اصول قرآن نے یہ فرمایا الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى (92:18) جو کوئی شخص اپنا مال دوسروں پر صرف کرتا ہے اس کا تزکیہ نفس ہو جاتا ہے اسلامی مملکت کا ایک ایک فرد اپنے تزکیہ نفس کی خاطر اپنا مال دوسروں پر خرچ کرتا ہے۔ ہمارے ہاں جو حضرات اپنی دانست میں اللہ کی زیادہ اطاعت کرنا چاہتے ہیں تو وہ نوافل، اور تہجد کی نماز شروع کر دیتے ہیں۔ ان کی اس پرستش سے اللہ تعالیٰ کی ''اطاعت'' بالکل نہیں ہوتی۔ البتہ جو

لوگ اللہ کی اطاعت کے زیادہ خواہاں ہیں اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی آمدنی میں اضافہ کریں۔ اپنی ملازمت کے علاوہ اور Part time کام کریں، زیادہ سے زیادہ کمائیں اور زیادہ سے زیادہ دوسروں پر خرچ کریں۔ اس سے تزکیہ نفس ہوتا ہے۔ اسی کو قرآن نے تقویٰ بھی کہا ہے (92:12)

ہمارے ہاں پرستش کے ذریعہ تقویٰ حاصل کیا جاتا ہے لیکن قرآنِ کریم نے وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى ۝ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّىٰ ۝ (92:17-18) ترجمہ: اور بچا دیں گے اس سے بڑے ڈرنے والے کو، جو اپنا مال دیتا ہے دل پاک کرنے کو۔ آپ ملاحظہ فرمائیں کہ قرآنِ کریم نے متقی کی تعریف یہ کی ہے کہ جو اپنا مال دوسروں پر صرف کر دیتا ہے وہ اتقی ہوتا ہے۔ سورہ توبہ میں ارشاد ہے خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۖ (9:103) ترجمہ: ان کے مال سے صدقے لے تاکہ تو ان کو پاک کرے وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا (9:103) پھر ان صدقات کے ذریعے ان کے تزکیۂ نفس پر غور فرمائیں کہ قرآنِ کریم تزکیہ نفس کا کیا طریقہ بیان کر رہا ہے اس بات کو ملحوظ رکھیں کہ یہاں بِهَا کی ضمیر بڑی عجیب چیز ہے۔ اس ضمیر نے یہ بات واضح کی کہ تزکیہ صدقے اور اموال کے ذریعے ہوتا ہے پرستش کے ذریعے نہیں ہوتا۔ افسوس ہے کہ ہمارے علماء نے یہ بات Notice نہیں کی۔

(3) تیسری قدر کا حکم سورۃ بقرہ میں ہوا ارشاد عالی ہے وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ ۖ قُلِ الْعَفْوَ ۗ (2:219)، حضرت شیخ الہند نے اس کا ترجمہ کیا ہے ''اور تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں کہہ دیجئے جو بچے اپنے خرچ سے، آیت کریمہ اس قدر واضح ہے کہ اس میں نہ کوئی ابہام ہے اور نہ کوئی التباس۔ حضرت اقدس نے ترجمہ بالکل درست فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا ترجمہ کر ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ یہ ترجمہ کرنے پر مجبور تھے، لفظ ہی کل دو ہیں۔ لیکن انہوں نے یہ ترجمہ بخوشی نہیں کیا۔ چونکہ انہوں نے جو حاشیہ اس آیت پر تحریر کیا ہے وہ قرآن کا حکم نہیں ہے وہ انہوں نے اپنا نقطہ نظر تحریر کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں وہ تحریر کرتے ہیں ''لوگوں نے پوچھا تھا کہ مال اللہ کے واسطے کس قدر خرچ کریں حکم ہوا جو اپنے اخراجات ضروری سے افزود (زائد) ہو۔ کیونکہ جیسا آخرت کی فکر ضروری ہے۔ دنیا کی فکر بھی ضروری ہے اگر سارا مال اٹھا ڈالو تو اپنی ضروریات کیونکر پوری کرو اور جو حقوق تم پر لازم ہیں ان کو کیونکر ادا کرو۔ معلوم نہیں کس کس دینی و دنیاوی خرابی میں پھنسو''۔

اسی آیت کے ترجمہ میں حضرت نے ''اللہ کے واسطے'' الفاظ کا جو خود اضافہ کیا ہے۔ قرآن کریم میں ''اللہ کے واسطے'' کا کوئی ذکر نہیں ہے یہاں دو باتیں خیال میں رکھیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلامی نظام ایک ایک آدمی کی ایک ایک ضرورت پوری کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اگر وہ اس طرح ضروریات پوری نہ کرے تو وہ اسلامی نظام ہی نہیں ہے۔ افراد معاشرہ کی تمام ذمہ داریاں پوری کرنا نظام کا فرض ہے۔ اس لئے کسی کو کیا ضرورت کہ وہ مال جمع کرے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ سارا قرآن بغور مطالعہ فرمائیں آپ کو سارے قرآن میں ایک آیت ایسی نہیں ملے گی جو مال جمع کرنے کی اجازت دیتی ہو۔

تفسیر العروۃ الوثقیٰ میں بھی پیشوائیت کی ذہنیت اور اس کا رجحان صاف نظر آ رہا ہے انہوں نے تحریر فرمایا ''ضروریات

سے زائد مال راہِ الٰہی میں خرچ کرنا عفو ہے۔'' انہوں نے بھی مال خرچ کرنے کو راہِ الٰہی کے ساتھ منوط کیا ہے۔ جو کہ خلافِ قرآن ہے۔ کیوں کہ آیت میں راہِ الٰہی کے لیے کوئی الفاظ ہیں اور نہ اس کی قید۔

حضرت اقدس مولانا اصلاحی صاحب نے تدبر قرآن میں راہِ الٰہی کی قید کا اضافہ کیا ہے وہ فرماتے ہیں'' یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں وہ انفاق زیر بحث نہیں ہے جو عام مستحقین کے لیے صدقاتِ واجبہ اور زکوٰۃ وغیرہ کی صورت میں ہر مسلمان پر ضروری ہیں بلکہ یہ وہ انفاق ہے جس کا تعلق جہاد، اعلائے کلمۃ اللہ اور تحفظ و دفاعِ ملت سے ہے۔'' (جلد اوّل، صفحہ:516) لیکن یہ بات حضرت کی قرآن کے بالکل خلاف ہے۔

(4) اسلامی معاشی نظام کی اہم مستقل اقدار اور بھی ہیں اور ہمارا ارادہ تھا کہ ان میں سے چند مزید اقدار کا تذکرہ کریں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلامی نظام کی معاشی اقدار میں جو اہمیت زکوٰۃ کی ہے وہ سب سے زیادہ ہے۔ اسلامی نظام کا قیام ہی صلوٰۃ، زکوٰۃ دوستون پر استوار ہوتا ہے۔ چونکہ یہ مضمون زیادہ طویل ہو گیا ہے اس لئے ہم بھی دوسری اقدار کو چھوڑتے ہیں کیونکہ ہم چاہتے ہیں کہ زکوٰۃ کے متعلق تھوڑی تفصیل عرض کر دیں۔

آپ غور فرمائیں کہ ہم مسلمانوں کی کیا بدبختی ہے کہ ہم نے اپنے معاشی نظام کی بنیاد رکھتے ہوئے قرآنِ کریم کی ان تمام بنیادوں (آیتوں) کو پسِ پشت ڈال دیا جو ہم نے ابھی تحریر کی ہیں اور اسلامی نظام کی پوری اساس ایک وضعی حدیث پر قائم کی ہے، اور اس حدیث پر یہ عمارت چلی آ رہی ہے ہم اس کا بہت مختصر بیان تحریر کرتے ہیں ارشاد الٰہی ہے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ (9:34-35)

ترجمہ: اے ایمان والو بہت سے علماء اور راہب لوگوں کا مال باطل طور پر کھا جاتے ہیں اور اُنہیں خدا کی راہ سے روکتے ہیں اور جو سونا چاندی کا خزانہ جمع کر کے رکھتے ہیں اور خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے اُنہیں دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔ اس روز جب کہ اُنہیں آتش جہنم میں گرم کیا جائے گا اور جلایا جائے گا کہ بس ان کے چہروں، پہلوؤں اور پشتوں کو داغا جائے گا (اور انہیں کہا جائے گا) یہ وہی چیز ہے کہ جسے تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا بس چکھو اس چیز کو جسے تم نے اپنے لیے ذخیرہ کیا تھا۔

اصل یہ ہے کہ ہماری پیشوائیت کا مزاج ہی سرمایہ دارانہ ہے۔ اس لئے انہوں نے اپنی مجموعی تعلیم میں، قرآن کی واضح تعلیم کے علیٰ الرغم، سرمایہ داری کو Plead کیا اور اس کی حمایت کی۔ اس وجہ سے ہمارے دانشوروں اور سیاستدانوں کا مزاج سرمایہ دارانہ ہے۔ اگر ہماری پیشوائیت برابر اور مسلسل قرآنِ کریم کا معاشی نظام پیش کرتی چلی آتی جس میں ایک پیسہ بھی جمع

کرنے اور دوسروں کی دولت کو Exploit کرنے کا امکان ہی نہیں ہے تو شاید ہمارے لیڈر اور حکمران اس درجہ کرپٹ نہ ہوتے اور نہ ہی ان کی یہ آف شور کمپنیاں ہوتیں۔ اب آپ اس آیۂ کریمہ کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں ''بغوی نے لکھا ہے کہ مجاہد نے حضرت ابن عباس کا بیان نقل کیا ہے۔ جب یہ آیت اُتری تو مسلمانوں کو یہ حکم بہت شاق گزرا انہوں نے کہا ایسا کون ہوسکتا ہے کہ اپنے بچوں کے لیے کچھ نہ چھوڑے۔ اس کا تذکرہ حضرت عمرؓ نے رسول اللہؐ سے کر دیا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا اللہ نے زکوٰۃ کو اسی لیے فرض کیا ہے کہ تمہارا باقی مال پاک ہوجائے۔ یعنی زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد باقی مال جمع کرنا ممنوع نہیں ہے اور ایسا مال ناپاک نہیں ہے۔ یہ روایت ابوداؤد م ابویعلی، ابن ابی حاتم، حاکم، ابن مردویہ اور بیہقی نے بھی حضرت ابن عباس سے نقل کی ہے۔

(تفسیر مظہری، جلد:6، صفحہ:179)

مسند احمد میں ہے کہ سونے چاندی کی مذمت کی یہ آیت جب اُتری صحابہؓ نے آپس میں چرچا کیا تو حضرت عمرؓ نے کہا لو میں حضورؐ سے دریافت کرآتا ہوں۔ اپنی سواری تیز کرکے رسول اللہؐ سے جا ملے اور روایت میں ہے کہ صحابہؓ نے کہا پھر ہم اولادوں کے لیے کیا چھوڑ جائیں۔ اسی میں ہے کہ حضرت عمرؓ کے پیچھے حضرت ثوبانؓ بھی تھے۔ آپؐ نے حضرت عمرؓ کے سوال پر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ اسی لئے مقرر فرمائی ہے کہ بعد کا مال پاک ہوجائے۔ میراث کے مقرر کرنے کا ذکر کیا جارہا ہے کہ جمع کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ حضرت عمرؓ یہ سن کر مارے خوشی کے تکبیریں کہنے لگے۔''

(تفسیر ابن کثیر، جلد دوم، صفحہ:306)

مضمون میں اتنی گنجائش نہیں کہ ہم ان تین روایات پر تبصرہ کریں۔ ورنہ ان روایات میں کئی باتیں خلافِ قرآن ہیں۔ اس مضمون کی روایت بخاری شریف میں تفصیل سے آئی ہے۔ ان چند روایات کی بنیاد پر ہمارے ہاں عقیدہ وضع ہوا ہے جو بالکل قرآن کے خلاف ہے کہ جس قدر، مال و دولت جمع کرلیں اس میں سے اڑھائی فیصدی ادا کر دیا جائے تو باقی سارا مال پاک ہوجاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے نظام میں مال دولت جمع ہی نہیں کیا جاسکتا۔ اس نظام میں ہر فرد اپنی مرضی اور خوشی سے اپنی اپنی طاقت و استعداد کے مطابق پوری دیانتداری سے کام کرتا ہے اور اپنی ساری محنت سے جو وہ کماتا ہے اس میں سے وہ اپنی ضرورت کے مطابق بچالیتا ہے اور باقی سب کچھ وہ دوسروں کو دیدیتا ہے کہ اس کے ذریعے اس کا تزکیہ نفس ہوتا ہے۔ اس نظام میں خود نظام ہر شخص کی ضروریات پوری کرتا ہے۔ اس لئے اس میں کسی شخص کو مال جمع کرنے کی خواہش ہی نہیں ہوتی۔ جب ہر شخص کی ضروریات از خود پوری ہُوں رہی ہو تو پھر کوئی شخص کس وجہ سے مال جمع کرے۔ قرآن کی رُو سے مال خرچ کرنے والوں کے بڑے درجات ہیں اور مال جمع کرنے والوں کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد
dr.inam57@gmail.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(قسط سوم)

قرآنی تعلیمات کے مطابق مرد عورت سے افضل اور نہ ہی عورت مرد سے کمتر ہے

قرآن سے (32:5) یہ وضاحت بھی ملتی ہے کہ یہ سب ارتقاء کے مراحل یونہی اتفاقیہ رونما نہیں ہو رہے بلکہ ایک مقصد کے تحت ایسا ہو رہا ہے۔ یہ مقصد محض مقصد ہی نہیں بلکہ یہ مقصد ایک خود شناس شعور اور ایک خلاق، قدیرِ مطلق خدا کی ذات کا طے کردہ ہے، جو اس مقصد کی اصل حقیقت اور قوت کے طور پر ادراکِ انسانی سے باہر ہے۔

انسانی جدید نظریہ ارتقاء نے قدیم نظریہ ارتقاء اور آدم اور اُس کی پسلی سے اُس کو سکون مہیا کرنے والی حوا کے سبھی نظریات کو رد کر دیا اور قرآن نے سورہ النساء میں بطور زوج عورت کی کمتر پیدائشی حیثیت کی بھی نفی کر دی۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً (4:1)

اے انسانو! تم اپنے رب کے قانون کی نگہداشت کرو، جس نے تمہاری پیدائش کی ابتدا ایک نفس واحدہ (ایک جرثومۂ حیات) سے کی، اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور پھر (نر و مادہ کے اختلاط سے) بہت سے مرد اور عورتیں دنیا میں پھیلا دیئے۔

''قرآن کہہ رہا ہے کہ زندگیوں کی ابتدا ایک نفس واحدہ سے ہوئی، اور اسی نفس واحدہ سے، اس کا جوڑا پیدا کیا''۔ قرآن کا یہ بیان ظاہر کر رہا ہے کہ نفس واحدہ یعنی ایک جرثومہ حیات خدا نے سب سے پہلے پیدا کیا تھا۔ ''اور پھر نر و مادہ سے بہت سے مرد و عورتیں دنیا میں پھیلا دیئے۔''

اب زندگی کی داستان یوں بنتی ہے، اور جس کی سائنس نے بھی تصدیق کی ہے، کہ خدا نے ایک جرثومہ حیات مٹی کے جوہر اور پانی کے امتزاج سے پیدا کیا۔ ازاں بعد یہ جرثومہ حیات جوشِ نمو سے دو حصّوں میں تقسیم ہو گیا، جس سے نر و مادہ کی تقسیم یا تمیز وجود میں آئی۔ یہ سلسلہ قانون ارتقاء کے تحت چلتا رہا۔ مختلف طویل ارتقائی مراحل طے ہوتے ہیں، جن میں سے کوئی مرحلہ ایک ایک ہزار سال طویل اور کوئی پچاس پچاس ہزار سال طویل ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ ایک وقت ایسا آیا جب زندگی نے نر و مادہ کے اختلاط سے آگے چلنا شروع کیا اور زندگی کی مختلف شاخیں وجود میں آتی چلی گئیں۔ یہاں تک زندگی کی ایک شاخ پیکر انسانی میں آ گئی۔ انسانی پیکر میں آنے سے پہلے زندگیوں میں سلسلہ تولید و تناسل جاری رہا ہے اور انسانی پیکر میں

آنے کے بعد، بھی دیگر جانداروں کی طرح آج بھی یہ سلسلہ انسانوں میں جاری ہے۔

عربی زبان میں زوج ایسے دو حصوں کو کہتے ہیں جن کے ملنے سے ان دونوں کی پیدائش کی تکمیل ہو جائے یا وہ دونوں با مقصد ہو جائیں۔ مثلاً گاڑی کے دو پہیّے ایک دوسرے کے زوج ہیں۔ گاڑی میں دونوں صحیح سلامت ہوں، تو دونوں کی تخلیق کا مقصد پورا ہوتا ہے۔ ایک نہ ہو یا ایک خراب ہو تو دوسرا بھی بے مقصد ہو جاتا ہے۔ اسی طرح میاں بیوی دونوں ایک دوسرے کے زوج ہیں، دونوں یکساں ہیں، نہ کوئی کمتر اور نہ کوئی برتر، دونوں ہی واجب التکریم ہیں۔ نہ تو اکیلا آدمی اور نہ ہی اکیلی عورت اپنی پیدائش کے مقصد کو پورا کر سکتے ہیں۔ ان دونوں کے اختلاط سے مرد یا عورتیں پیدا ہوتے ہیں۔ زوج صرف عورت ہی کو نہیں کہتے بلکہ مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے کے زوج ہیں۔ ہر زوج اپنی تکمیل کے لیے دوسرے کا محتاج ہے۔

چھٹی دلیل، مرد کو بیک وقت چار عورتوں کو نکاح میں رکھنے کی اجازت:

ہمارے ہاں عورت کے مقام کو پیدائش ہی سے نہایت ہی پست اور اضافی پوزیشن کا درجہ دیا جاتا ہے، جس میں بیوی کو اپنے شوہر کا ہر لحاظ سے محکوم سمجھا جاتا ہے۔ اِس کے لئے یہ دلیل دی جاتی ہے کہ قرآن میں مرد چار عورتوں سے بیک وقت نکاح کر سکتا ہے، جبکہ بیوی اِس طرح دوسرا شوہر نہیں رکھ سکتی۔ لہٰذا اِس دلیل کا بھی قرآن کی متعلقہ آیت کے حوالہ سے حقیقت جاننے کے لئے جائزہ لیا جاتا ہے۔

ایک سے زیادہ نکاح کی مردوں کو اجازت دینا:

پہلا سوال مردوں کو بیک وقت ایک سے زیادہ چار تک نکاح کرنے کی اجازت دینے سے تعلق رکھتا ہے۔ اِس اجازت کا درجِ ذیل آیت میں قرآن میں ایک ہی بار ذکر کیا گیا ہے کہ:

وَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا فِی الۡیَتٰمٰی فَانۡکِحُوۡا مَا طَابَ لَکُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ مَثۡنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تَعۡدِلُوۡا فَوَاحِدَۃً اَوۡ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ ؕ ذٰلِکَ اَدۡنٰۤی اَلَّا تَعُوۡلُوۡا ؕ (4:3)

اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم یتیموں کی بہبود کے معاملے میں انصاف نہ کر سکو گے تو عورتوں میں سے جو تمہارے لئے جائز اور پسند ہوں دو دو، تین تین، چار چار عورتوں تک سے نکاح کر لو۔ لیکن اگر ڈر ہو کہ ان کے درمیان عدل نہ کر سکو گے، تو پھر ایک ہی بیوی کے اصول پر بھروسہ کرو، یا وہ لونڈیاں جنہیں تُم اپنے نکاح میں لا چکے ہو۔ بے انصافی سے بچنے کے لئے یہ راہ قرینِ صواب ہے۔

بیک وقت چار بیویاں رکھنے کی اجازت کی حقیقت تلاش کرنے کے لئے ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں قسط اور عدل دونوں کے معنی انصاف کے ہیں، لیکن اس میں ایک باریک سا فرق ہے۔ مثلاً عدل کے معنی ہوں گے ''دو آدمیوں میں برابر کا سلوک کرنا۔ اور قسط کے معنی ہوں گے'' کسی کے حقوق و واجبات کو پورا پورا ادا کر دینا۔

فَانۡکِحُوۡا عربی گرامر کی رو سے ''ف جزا کے لیے آتی ہے۔ لہٰذا اس کے معنی ہوئے کہ اگر یہ بات ہو تو یہ کرو، اور اگر یہ

بات نہ ہو تو یہ نہ کرو۔

سیاق و سباق میں دیکھا جائے تو اس آیت سے پہلے کی آیت (4:2) میں یتیموں کے مال کو سنبھالنے کی ہدایات دی گئی ہیں۔ لیکن یتیم عورتوں کے واجبات کی ادائیگی میں بات صرف مال سنبھالنے کی نہیں ہوتی، بات اس سے بھی آگے جاتی ہے۔ واجبات میں عورتوں کے مال کے ساتھ ان کے جذبات کا بھی لحاظ رکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اس لئے اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ عورتوں کو نکاح کے لئے مرد نہیں مِل رہے تو اِن حالات میں ایسی آفت زدہ یتامیٰ کے اپنے گھر میں آزادی سے رہنے کی بِنا پر واجبات و حقوق پورے نہ ہونے کی ہنگامی صورت میں اِن کو سہارا دینے کے لیے اجازت دی گئی کہ

اگر معاشرہ فیصلہ کرے، تو اس کے مطابق دو دو، تین تین، چار چار یتیم (یعنی بے شوہر 4:127) عورتوں سے شادی کر لو (جو تمہارے نکاح میں بھی آنا چاہیں 4:19)۔ ایسے ہنگامی حالات میں ایک مرد، ایک بیوی کے قانون میں استثناء دی گئی، لیکن ایک سے زیادہ شادی کرنا معاشرہ کے فیصلہ پر منحصر ہوگا، نہ کہ انفرادی فیصلے پر۔ پھر ان شادیوں کو بیویوں کے درمیان بھی ایک دوسری شرط عدل کرنے کے ساتھ مشروط کر دیا گیا۔

ہمارے رائج الوقت قانون نے بھی قرآن میں دی گئی ایک سے زیادہ نکاح کی صورت میں یتامیٰ کے حقوق کے فرائض کی ادائیگی کی شرط کو تو نظر انداز کر دیا، لیکن بیویوں کے درمیان عدل کی شرط کو برقرار رکھتے ہوئے صرف موجود بیوی کی اجازت لینے کی شرط پر اکتفاء کرنا مناسب سمجھا۔ فقہِ حنفی کی طرف سے دی گئی اِس قسم کی سہولت کو مدّنظر رکھتے ہوئے، ہمارے مُلک کے قوانین میں نہ صرف اجازت کو لازمی قرار دے دیا گیا، بلکہ اِس شرط سے انحراف کرنے کی صورت کو قابلِ تعزیر جُرم قرار دیتے ہوئے سزا بھی مقرر کر دی۔

اِس کے باوجود آج علمائے کرام حکومتِ وقت سے دوسری شادی کے لئے پہلی بیوی کی اجازت کو ختم کرانے کے لئے سراپا احتجاج بنے بیٹھے ہیں۔ قرآن میں واضح طور پر یہ بھی کہا گیا کہ اگر کسی بیوی کی طرف معلق ہونے کی صورت میں عدل نہ کر سکو، تو پھر ایک وقت میں ایک بیوی کے اصول پر عمل کرو۔ مکتبِ مُلا اِس عدل کو جنسی عدل سے از خود منسوب کر کے اُمت کو ایک نئی قسم کا درس دینے میں اپنی توانائیوں کو صَرف کرنے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا۔

تاریخ میں ہمیں یہ شہادت بھی ملتی ہے کہ اپنے گھر میں خوش شادی شدہ مومنات جب یتامیٰ کی آفت زدہ زندگی کی طرف توجہ کرتیں، تو وہ اپنے شوہروں سے اُن کے ساتھ نکاح کر کے اُن کا بوجھ بانٹنے پر آمادہ اور اصرار کیا کرتی تھیں۔ اِن مومنات کی پہچان بھی قرآن اِن الفاظ میں سامنے لاتا ہے کہ

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۭ (59:9)

وہ دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات میں تنگی میں رہ کر ترجیح دیتے ہیں۔

اِس طرح سے دیکھا جائے تو مخصوص حالات میں ایک سے زیادہ یتامیٰ عورتوں سے شادی کی اجازت دے کر اُن کی

بہتری کو مدِ نظر رکھا گیا ہے اور مرد حضرات پر اضافی بوجھ ڈال دیا گیا ہے۔

اِن مخصوص حالات کی بنا پر بیک وقت چار شادیوں کی اجازت کی قرآن میں مثال خود رسولِ اکرم ﷺ کو اِس ہدایت دینے سے واضح کیا کہ:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ۝ (33:28)

اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تمہارے پیش نظر محض طبیعی (دنیا کی) زندگی کا مفاد ہے، اور دنیاوی زیب و زینت کی زندگی بسر کرنا ہے، تو آؤ، میں تمہیں ضروری سامان دے کر نہایت عمدگی کے ساتھ رخصت کر دیتا ہوں (33:51)۔

جنگ کرنا اور فتوحات کرنا، تو نظام خداوندی کے مخالفین کی مخالفت دور کرنے کا ذریعہ ہیں۔ لیکن اصل مقصد تو افرادِ معاشرہ کی صحیح تعلیم و تربیّت ہے، جس سے یہ اس قابل ہو سکیں کہ دنیا میں عدل و مساوات قائم کریں۔ اس مقصد کے تحت عورتوں کی ذمّہ داریاں، مَردوں سے کچھ کم نہیں ہیں۔ اس لئے مَردوں کی تربیّت کے ساتھ ساتھ عورتوں کی بھی مناسب تربیّت کرنا ضروری ہے۔ اس تربیّت کا آغاز خود رسول کے گھر سے ہونا چاہیئے، جن کو دوسروں کے لئے نمونہ بننا تھا۔ بیویوں پر واضح کیا جا رہا ہے کہ اگر تمہیں نبی کی رفاقت میں رہنا ہے، تو تمہاری زندگی کا مقصد نبی کے مشن کی تکمیل ہونا چاہیئے۔ لیکن اگر تمہارے پیش نظر محض دنیاوی مفاد اور خوشگوار دنیاوی زندگی ہے، تو پھر نبی کے ساتھ تمہاری رفاقت نہیں ہو سکتی۔ رفاقت تو مقصد کی ہم آہنگی کا نام ہے۔ اگر مقصد ہی میں اشتراک نہیں ہے، تو پھر رفاقت کیسی؟

نبی کی بیویاں، لڑائیوں کی وجہ سے پیدا شدہ ہنگامی حالات کی وجہ سے تعداد میں زیادہ تھیں۔ ان میں سے وہ بھی تھیں جو جنگوں کی وجہ سے بیوہ ہو گئیں تھیں اور وہ بھی تھیں جو مسلمان ہو کر اور مکّہ چھوڑ کے مدینہ آ گئیں تھی۔ خدا نے ان کو واپس کر دینے سے منع کر دیا تھا۔ ایسی خواتین میں سے جو اُن خاندانوں کی عورتیں تھیں، جو معاشرے میں بلند مقام رکھتے تھے، ان خواتین کو رسولؐ اللہ نے، ان کی مرضی سے، ان کی حفاظت اور پناہ کی غرض سے اپنے عقد میں لے لیا تھا۔ اب جبکہ حالات اعتدال پر آ گئے تھے، تو انہیں اپنے سابقہ فیصلے پر نظر ثانی کی اجازت دی جا رہی ہے۔ اس لئے کہا جا رہا ہے کہ میں تمہیں اپنے ساتھ رہنے پر مجبور نہیں کرنا چاہتا کہ تم ہر حالت میں میرے ساتھ رہو۔ ان بدلے ہوئے حالات میں، اگر تمہاری منشآء الگ ہو جانے کی ہو، تو پھر میں تمہیں خالی ہاتھ نہیں بلکہ کچھ نہ کچھ دے دلا کر نہایت عمدگی کے ساتھ رخصت کروں گا۔ اب تم یہ نہ سمجھ لینا کہ مملکت حاصل ہو گئی ہے، اور نبی اس کا سربراہ ہے، تو تمہاری زندگی شاہانہ ٹھاٹھ سے گزرے گی۔ بے شک مملکت تو حاصل ہو گئی ہے، لیکن جو ذمّہ داریاں اب عائد ہوئی ہیں، ان سے عہدہ برا ہونے کے لئے ضروری ہے کہ نبی کے گھر کا معیار، مملکت کے غریب ترین فرد کی زندگی کا سا ہو۔ اس لئے مجھے اور میری بیویوں اور دیگر متعلقین کو، غریبوں کی سی زندگی بسر کرنا ہو گی۔ اگر یہ پوزیشن منظور ہو تو میرے نکاح میں رہو اور اگر خوشحالی پیش نظر ہے، تو اپنے سابقہ فیصلے پر نظر ثانی کر لو۔ تاریخ بتاتی ہے کہ آپ ﷺ کی بیویوں میں سے کسی ایک نے بھی علیحدگی کا فیصلہ نہ کیا تھا۔

ساتویں دلیل:

قرآن کا عورت کو لونڈی کا مقام دینا۔

عورتوں کی حیثیت کو کم تر ثابت کرنے کے لئے مرد کے غلام کے مقام سے صرفِ نظر کرتے ہوئے عورت کے لونڈی کے مقام کو سامنے لاکر مرد سے کمتر ہونے کی دلیل کو سامنے لایا جاتا ہے۔ لہٰذا یہاں قرآن کے غلامی کے تصور کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔

اسلام میں غلام اور لونڈیاں رکھنے پر اعتراض کا تجزیہ:

اسلام سے پہلے، اور جب اسلام آیا، تو ساری دنیا میں غلامی کا رواج تھا۔ خود مکہ کی 75 فیصد آبادی غلاموں اور لونڈیوں پر مشتمل تھی۔ یہ غلام اور لونڈیاں جنگ میں ہاتھ لگنے والے قیدی ہوتے تھے۔ ان کی اولاد بھی غلام ہوتی تھی، پھر ان کی تجارت ہوتی تھی۔ غلامی پر موثر اعتراض زمانۂ جاہلیت کے عرب کا اوپر کا طبقہ کرسکتا تھا، لیکن اُنہوں نے دنیاوی مفاد کے تحت انصاف کرنے کے عمل کی طرف دھیان نہیں دیا۔

قرآن نے آکر ہر قسم کی غلامی کی صورت کے خاتمہ کا یہ اصول دے کر اعلان کر دیا کہ

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (17:70)

تمام نوعِ انسانی (نر و مادہ) پیدائش کے اعتبار سے ہی یکساں تکریم و احترام کے مستحق ہیں۔

بنی آدم میں تو سبھی نر و مادہ سمیت پوری نوعِ انسانی ہوتی ہے۔ دین کا ما حاصل تو شرف و اکرام انسانیت ہے، تو دین الاسلام میں غلامی کے تصور کے پنپنے کی گنجائش ہی نہیں بنتی۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ عرب اقوام میں جنگ جیت کر مالِ غنیمت میں قید ہونے والوں کو لونڈی اور غلام بنا کر تقسیم کر لیا کرتے تھے۔ اسلام لانے کے بعد مسلمانوں نے جنگی قیدیوں کے ساتھ مہمانوں جیسا سلوک کیا، ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے اور بالآخر اِن کی معاشرہ میں آمد کا یہ فرمان دے کر آئندہ کے لئے چور دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا کہ:

فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ط حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۙ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ۚ (47:4)

سو جب میدانِ جنگ میں اُن (دُشمن) سے آمنا سامنا ہو، تو تُم بھی اِنہیں قتل کرو۔ جب اُن کی قوت ٹوٹ جائے اور تُم غالب آجاؤ تو بقیۃ السّیف کو مضبوطی سے باندھ کر جنگی قیدی بنالو۔ پھر (جیسے حالات کا تقاضہ ہو) تو قیدیوں کو فدیہ تاوانِ جنگ یا قیدیوں کے تبادلہ کی صورت کے فدیہ کے عوض چھوڑ دو اور یا فدیہ لیے بغیر احساناً چھوڑ دو یہاں تک کہ جنگ خود اپنے ہتھیار پھینک دے۔

اب اگر ایسی حالت ہو کہ تمہارے قبضے کی وجہ سے جنگ کا تاوان دینے والی حکومت ہی نہ بچے یا کسی کا فدیہ ادا کرنے والا کوئی نہ ہو، تو ایسے حالات کے لیے کہا فَاِمَّا مَنًّۢا (47:4) ''ان کو احسان کے طور پر چھوڑ دو''۔ قرآن کریم کی یہ ایک ہی

آیت ہے، جس میں قیدیوں کو چھوڑنے کے دو طریقے بتائے۔

(1) فدیہ لے کر اور یا

(2) احساناً ان کو چھوڑ دو۔

لہٰذا اِس طریق سے اور غلام بنانے کے دروازے کو بند کر کے آئندہ کے لئے غلام و لونڈی رکھنے کی رسمی اجازت ہی ختم کر دی۔ اُس زمانے میں قیدیوں کے لیے الگ کیمپ نہیں بنتے تھے اس لیے قیدیوں کو مہمانوں کی طرح گھروں میں رکھنے کے لیے تقسیم کیا جاتا تھا۔

اُس زمانے میں دوسرے مزدور تو تھے نہیں، یہی غلام اور لونڈیاں ان کے کام کرتے تھے۔ اتنے مردوں، عورتوں اور لڑکیوں کو معاشرہ سے نکال دیا جاتا، تو نہ وہ گھر میں رہتیں اور نہ باہر غلامی میں، تو اِس کے نتیجہ میں ظاہر ہے کہ معاشرہ ابتر ہو جاتا۔ قرآن نے حکمت سے یوں کام لیا کہ پہلے تو قیدی بنانے کے لئے جو ایک ہی سرچشمہ تھا، اُس کو یہ حکم دے کر بند کیا یعنی جنگ میں قیدی کو ہر حال میں آزاد کرنے کا حکم دیا۔

پھر بات بات پر کفارہ کے طور پر غلام اور لونڈیوں کو آزاد کرنے کا حکم دیا۔ غلام اور لونڈی کو آزاد کرنے کو صدقہ قرار دیا اور اس کو فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ (90:13) کہہ کر بہت بڑا کارِ خیر بتایا گیا کہ دوسروں کی گردنوں کو آزاد کراؤ اور انہیں سرفراز کرو۔ پھر غلاموں کی رہائی کیلئے مکاتب کا حکم دیا۔ قرآن نے کاروبار شروع کرنے کے لیے سرمایہ مہیا کرنے کو مکاتب کہا ہے کہ یہ قرض ہے اسے لکھ لو۔ پھر لونڈیوں کو بیویوں کا سا درجہ دینے کے لیے احکام نازل کئے تاکہ یہ معاشرے میں ضم ہو جائیں۔ ان کو گھروں میں رکھو گے تو ان کا درجہ بیویوں جیسا ہوگا، ان کی اولاد ہوگی، تو وہ تمہاری اولاد ہوگی، وہ تمہاری وراثت میں بھی حق دار ہوگی۔ ویسے بھی جہاں قرآن میں اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ الفاظ آئے ہیں، وہ ماضی کے صیغہ میں ہیں، یہ کہیں بھی مستقبل کے صیغے میں نہیں ہیں۔

اگر دیکھا جائے تو قرآن نے ماضی کے جس غلامی کے دور کا ذکر کیا ہے، اُس میں دونوں مرد بطور غلام اور عورت بطور لونڈی شامل ہوتے ہیں، لہٰذا اس سے مرد اور عورت کی حیثیت یکساں رہتی ہے، لہٰذا اس سے عورت کو کمتر ثابت کرنے کی منطق نہیں بنتی۔

آٹھویں دلیل:

بیوی کو شوہر کو طلاق دینے کے حق سے محروم کرنے کی صورت میں۔

مکتبِ مُلا کی طرف سے شوہروں کو طلاق کے لفظ کی ادائیگی کے ساتھ ہی فوری طور پر اس کے وقوع پذیر ہونے اور عورتوں کا عدالت سے خُلع حاصل کرنے کے لئے مدتوں انتظار کرنے کا جو مُتضاد جانبدارانہ طریقِ کار سامنے لایا جاتا ہے، اُس سے بھی عورت کی پوزیشن کو کمتر سمجھنے کی روش کو تقویت مِلتی ہے۔ لہٰذا اس کا قرآن اور رائج الوقت پاکستان کے قانونی

تناظر میں تجزیہ کرنا بھی لازم ہوجاتا ہے۔

طلاق کا رائج الوقت قانونی اور قرآنی موقف:

قرآن سے ہمیں طلاق کا ارادہ کرنے کے وقت سے کر اُسے اختتام تک پہنچانے کے عمل میں ایک طویل طریقہِ کار نبھانے کی ہدایت ملتی ہے۔ اسی طریقہ کار کی پاسداری میں حکومتی قانون میں وضاحت کی گئی ہے کہ طلاق کا لفظ دُہرانے سے طلاق نہیں ہوتی بلکہ اِس کے لئے حکومت کی طرف سے متعین کی گئی مجاز اتھارٹی کو باقاعدہ درخواست/نوٹس کی کاپی فراہم کی جاتی ہے۔ اگر میاں بیوی کی طرف سے ازدواجی رشتے سے علیحدہ ہونے کی اطلاع/نوٹس حکومت کے نمائندے کو نہ دی جائے تو ایسی طلاق کے غیر موثر ہونے کے علاوہ اسے ایک قابلِ تعزیر جُرم قرار دیتے ہوئے دو سال تک قید کرنے کی سزا کا مستحق گردانا گیا ہے۔ اِس نوٹس کے بجھوانے کے بعد قرآن مجاز اتھارٹی کو ہدایت دیتا ہے کہ:

وَاِنۡ خِفۡتُمۡ شِقَاقَ بَیۡنِهِمَا فَابۡعَثُوۡا حَكَمًا مِّنۡ اَهۡلِهٖ وَحَكَمًا مِّنۡ اَهۡلِهَا ۚ اِنۡ یُّرِیۡدَاۤ اِصۡلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَیۡنَهُمَا ؕ (4:35)

(عام مردوں عورتوں کے علاوہ) اگر تمہیں کسی میاں اور بیوی کے درمیان جدائی کا اندیشہ ہو، تو ایک ثالث مرد کے خاندان سے، اور ایک ثالث عورت کے خاندان سے مقرر کرو۔ اگر یہ دونوں (میاں بیوی) باہمی مصالحت کا ارادہ کرلیں اور ثالث اصلاح کی نیّت سے، موافقت پیدا کرنے کی کوشش کریں، تو خدا کا قانون اِن ثالثوں کے ذریعے میاں اور بیوی میں موافقت پیدا کردے گا۔

میاں بیوی کے درمیان مصالحتی کوششوں کی اہمیت:

اختلافی ماحول میں، جذباتی طور پر، کوئی بھی فریق درست فیصلہ نہیں کرسکتا۔ اسی لئے اس آیت میں ہے کہ اگر میاں بیوی میں اختلافات پیدا ہوجائیں، علیحدگی تک نوبت پہنچ جائے، تو ان دونوں کے درمیان تیسرے فریق کو آنا چاہیے۔ اگر فریقین میں شدتِ جذبات سے مغلوب ہونے کی وجہ سے اختلافات پیدا ہوئے ہیں، تو وہ صحیح فیصلہ نہیں کرسکیں گے، معاملات کو مزید الجھاتے چلے جائیں گے۔

فرد سے مخاطب نہیں ہوا جارہا بلکہ جمع کے صیغے میں اسلامی حکومت کے اربابِ اختیار سے کہا جارہا ہے کہ: وَاِنۡ خِفۡتُمۡ شِقَاقَ بَیۡنِهِمَا ''جب بھی تمہیں احساس ہو کہ میاں بیوی میں اختلافات پیدا ہورہے ہیں تو'' فَابۡعَثُوۡا حَكَمًا مِّنۡ اَهۡلِهٖ وَحَكَمًا مِّنۡ اَهۡلِهَا ۚ ''تم ثالثی کرنے کے لیے ایک نمائندہ بیوی کے خاندان سے اور ایک نمائندہ خاوند کے خاندان سے مقرر کرو۔ اگر حکومتی ڈھانچہ نہیں ہے، تو ثالثی مقرر کرنے والا معاشرے کا سردار ہوسکتا ہے، اور اگر حکومت موجود ہے تو عدالت ثالثی مقرر کرسکتی ہے، تاکہ یہ غیر جذباتی ماحول میں مصالحت کی کوئی راہ نکالیں حَکَم مصالحتی یا ثالثی نمائندے کو کہتے ہیں۔

آگے آیت ہے کہ اِنۡ یُّرِیۡدَاۤ اِصۡلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَیۡنَهُمَا ؕ ''اگر وہ (میاں بیوی) اور ثالث مصالحت کے ارادے

سے کوشش کریں گے، تو خدا ایسی توفیق دے گا کہ کسی طرح نبھا ہو جائے'' یعنی خدا چاہتا ہے کہ مصالحت کی صورت پیدا ہو جائے۔ آگے ہم دیکھیں گے کہ اگر تین ماہ کی مصالحتی کوششیں بے کار چلی جائیں، تو پھر عدالت طلاق کی توثیق کر دیتی ہے کہ یہ اب میاں بیوی نہیں رہے۔ اِس طرح ایک بار کی طلاق کا طریقہِ کار مکمل ہو جاتا ہے۔

ہمارے مُلک کے رائج الوقت قانون میں قرآن کی اِس شِق پر من وعن قانون مرتب کیا گیا ہے۔ اگر میاں بیوی کی طرف سے ازدواجی رشتے سے علیحدہ ہونے کی اطلاع/نوٹس حکومت کے نمائندے کو نہ دی جائے تو اسے ایک قابلِ تعزیر جُرم قرار دیتے ہوئے قید کرنے کی سزا کا مستحق گردانا گیا ہے۔ بورڈ کو جب اطلاع وصول ہو، تو اُس کے لئے تین افراد کا ثالثی بورڈ تشکیل دینا لازم ہو جاتا ہے۔ ایسے افراد کا حکومتی ادارہ کے متعلقہ نمائندہ کی سرکردگی میں ایک دولہا اور دوسرا دُلہن کی طرف سے منتخب شدہ افراد کو شامل کیا جاتا ہے۔ مشاورتی بورڈ کے لئے یہ بھی لازم ہوتا ہے کہ وہ فریقین میں تین مہینوں کے اندر اتفاق سے کوئی قابلِ قبول صلح کرنے کی بھرپور کاوشوں سے کوئی راستہ نکالیں اور اِسی عرصہ میں اپنا فیصلہ سُنا دیں۔ اگر وہ فریقین میں طلاق کا فیصلہ سنائیں تو فیصلہ کے دن ہی سے پہلی طلاق کے نفاذ کا اطلاق ہوتا ہے۔

طلاق کی صورت میں عدالت کی طرف سے اِن احکام کو بھی نافذ العمل کرایا جاتا ہے کہ مرد جو کچھ بیوی کو دے چکا ہے، اب وہ اس میں سے واپس لینے کا حق دار نہیں۔ البتہ مال کا لین دین ہی علیحدگی میں رکاوٹ بن رہا ہے، تو عورت اپنے حق میں سے کچھ چھوڑ کر طلاق یا ہماری قانونی اصطلاح میں خُلع حاصل کر سکتی ہے۔۔ ایسی صورت ہو تو عورت کو طلاق دینے سے پہلے اس سے مال کی واپسی کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔

شوہر کی جانب سے نکاح کے موقعہ پر مہر کے حسبِ استطاعت ادائیگی نکاح کے وقت بیوی کو ایک تحفہ ہوتا ہے۔ مہر کی ادائیگی کی شرط نکاح کی لازمی شِق ہے، جس کو 1961ء میں قائم شدہ عائلی کمیشن کی سفارش پر مُلک کے رائج الوقت قانون میں من وعن شامل کیا گیا ہے۔ اِس کے مقابل دلہن والوں سے جہیز کا مطالبہ کرنا قرآنی اقدار کے منافی ہندوانہ روش ہے۔

یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ ''طلاق دینے کا حق صرف دو مرتبہ ہے''۔ طلاق، طلاق، طلاق چاہے ایک ہزار بار بھی کہا جائے رسول اللہؐ کے دور میں بھی اسے ایک ہی طلاق شمار کیا جاتا تھا۔ خدا نے طلاق کا حق دو مرتبہ دیا ہے۔ شوہر نے طلاق دے دی ہے، تو ایک صورت تو یہ ہے کہ عدت گزارنے کے بعد عورت نے کہیں شادی کر لی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ عدت کے عرصہ میں مرد اور عورت دونوں سابقہ نکاح کی طرف رجوع کر سکتے ہیں بشرطیکہ دونوں ایسا کرنے پر رضامند ہوں۔ یوں یہ دوبارہ میاں بیوی تو بن گئے لیکن مرد اپنی دو طلاقوں کے حق میں سے ایک طلاق کا استعمال کر چکا۔ اب مرد کے پاس صرف ایک بار طلاق دینے کا حق باقی بچ گیا۔ کچھ عرصہ بعد میاں بیوی میں ناچاقی ہو جاتی ہے اور شوہر طلاق دے دیتا ہے۔ اس طلاق کے بعد اگر عدت گزارنے کے بعد عورت کہیں شادی کر لیتی ہے، تو یہ دوسری بات ہے۔ لیکن اگر عدت کے عرصہ میں مرد اور عورت میں سازگاری پیدا ہو گئی ہے اور دونوں چاہتے ہیں کہ سابقہ نکاح کی طرف رجوع کیا جائے تو دونوں ایسا کر

سکتے ہیں۔ لہذا کسی طرح بھی قرآنی متن سے یہ اخذ کرنے کا جواز نہیں نکلتا کہ طلاق کا حق صرف شوہر کے پاس ہے اور ایسی دلیل کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

نویں دلیل:

عورتوں کو من گھڑت حلالہ کے عمل سے گزارنا۔

عمومی طور پر عورتوں کی کمتری کا ثبوت ایک بھرپور طریقہ سے حلالہ کے من گھڑت تصور کی صورت میں بھی پیش کیا جاتا ہے۔ روایتی کے تصور کے مطابق مرد کا ایک ہی بار تین دفعہ طلاق، طلاق اور طلاق کہہ دینے سے معیوب ہونے کے باوجود تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں۔ لہذا اب اگر شوہر دوبارہ اُسی بیوی سے نکاح کرنا چاہے، تو قرآنی اور پاکستانی قانونی پابندیوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے پہلے بیوی کا کسی دوسرے مرد سے حلالہ یعنی مباشرت سمیت نکاح کرائے۔ حلالہ میں لازم ہے کہ اُس کی بیوی کسی دوسرے مرد سے شادی کرے اور پھر حلالہ کے تصور میں درج باقاعدہ ایک لازمی شرط کے طور پر مجامعت کے عمل سے گزرنے کے بعد چاہے تو دوسرے روز ہی طلاق لے کر دوبارہ پہلے شوہر کے نکاح میں آنے کے لئے حلال تصور کی جائے گی۔

لگتا ہے کہ پورے ایک روز کی شرط بھی شائد مکتبِ مُلا نے مجامعت کے عمل سے گزرنے کے لئے آسانیاں فراہم کرنے کے لئے مہیا کی ہے۔ مجھے شروع ہی میں وضاحت کرنے میں کوئی امر مانع نہیں کہ یہ اعلان کر دوں کہ حلالہ کی پیشگی شرط رکھنا دھوکا بازی ہے، خدا کے قانون کے ساتھ مذاق ہے، اس لیے جائز نہیں۔ خدا کا قانون تو یہ ہے کہ مرد یا عورت میں سے جس کے پاس طلاق دینے کا حق ہے، وہ اپنے حق کو دو مرتبہ استعمال کر سکتا یا کر سکتی ہے۔ تین بار طلاق طلاق طلاق کہہ کر عورت کو نکاح کے دائرہ سے فارغ کر دینا، خدا کا بنایا ہوا قانون نہیں بلکہ اُس سے مذاق ہے۔ طلاق کا معاملہ نیلام کی طرح ایک دو تین کرنے والا نہیں ہے، یہ قانون کا معاملہ ہے اور مذہبی پیشوا کے ہاتھ میں دیا ہوا کھلونا نہیں کہ جس سے وہ اپنا اور اپنے جیسوں کا دِل بہلاتا رہے۔

قرآن کی روشنی میں طلاق کا طریق کار:

قرآن میں ہے کہ:

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ ۗ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا إِنْ ظَنَّا أَنْ يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ ۗ وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿2:230﴾

پس (35:4 آیت میں درج دو مرتبہ طلاق کا حق استعمال کرنے کے بعد) اگر وہ مرد (تیسری مرتبہ بھی) طلاق دے دے، تو وہ عورت اس کے بعد، اس شوہر کے لیے جائز نہیں ہے، تا آنکہ وہ اس کے سوا کسی دوسرے شخص سے ازخود نکاح نہ کر لے۔ پس اگر وہ (دوسرا شوہر) نامساعد حالات کے پیدا ہونے پر باقاعدہ سسٹم سے گزرتے ہوئے اس کو طلاق دے دے

(یا وہ وفات پا جائے) تو پھر اس پر کوئی گناہ نہیں، اگر وہ (سابقہ شوہر اور یہ عورت) پھر نکاح کر لیں۔ ایسی صورت میں بھی لازم ہے کہ یہ دونوں بخوشی یہ توقع رکھتے ہوں کہ وہ اللہ کی حدود پر قائم رہ سکتے ہیں۔

یہ ہیں (عائلی زندگی سے متعلق) قوانین کی حدود جنہیں اللہ ان لوگوں کے لیے واضح طور پر بیان کرتا ہے۔

اب خدا نے مرد کو جو دو مرتبہ طلاق کا حق دیا ہے، مرد اسے استعمال کر چکا۔

تین بار طلاق طلاق طلاق کہہ کر عورت کو فارغ کر دینا، خدا کا بنایا ہوا قانون نہیں ہے۔ طلاق کا معاملہ نیلام کی طرح ایک دو تین کرنے والا نہیں ہے، یہ قانون کا معاملہ ہے۔ طلاق اور اِس میں عدت کا عرصہ بھی شامل کر کے، اس کو اتنا طویل المدت بنا دیا گیا ہے کہ بمشکل ہی معاشرے میں دو دفعہ ایک میاں بیوی کی طلاق اور رجوع ہوتے نظر آتی ہے۔ حلالہ کا نام جس کو مکتبِ مُلا نے متعارف کرایا ہے، وہ تو دوسری کے بھی بعد تیسری طلاق کے بعد وقوع پذیر ہو سکتا ہے۔ اِس قسم کے شاذ امکان کو مکتبِ مُلا نے سازش کر کے صِرف تین بار طلاق، طلاق اور طلاق کہہ کر نہایت ہی مُختصر عرصہ میں حلالہ کا جواز بنا کر پیش کرتے ہوئے ایک سازش کی ہے، لیکن وہ زیادہ عرصہ تک عوام کو بیوقوف بنا کر عورت کا مقام کمتر نہیں رکھ سکے گا اور ایسی دلیل دینے کا سوچ بھی نہیں سکے گا۔

دسویں دلیل:

غیرت کے نام پر عورتوں کو قربان تک کر دینے کی رسم۔

مکتبِ مُلا کے متشدد طبقہ کی طرف سے عورت کے کمتر ہونے کی دلیل یہ کہہ کر بھی پیش کی جاتی ہے کہ مرد کی نظر میں عورت کی معمولی سی بُھول چوک پر غیرت میں آنا ایک فِطری عمل ہے جس کی وجہ سے وہ سخت سے سخت سزا کی مُستحق ہو جاتی ہے اور اِس امر میں مرد کی کوتاہیوں سے صَرفِ نظر کرنا بھی ایک فِطری عمل ہوتا ہے۔

اگر غیرت کی اِس ''فطری'' دلیل میں رتی بھر حقیقت ہوتی تو ''فطرت'' شوہر حضرات کو اپنی بیوی حلالہ کے لئے پیش کرنے کی ہمت ہی نہ دیتی۔

قرآن نے بنی اسرائیل میں بیان کی گئی درجِ ذیل آیت میں جمع کا صیغہ لا کر وضاحت کی ہے کہ قتل کی سزا دینے کا اختیار اجتماعی طور پر صِرف حکومتِ وقت کے پاس ہوتا ہے۔ لہٰذا فرد کے ہاتھوں اور یہاں مرد کے ہاتھوں کسی بھی غیرت وغیرہ کی آڑ لے کر عورت کے قتل کرنے کا کوئی اختیار اور جواز نہیں چھوڑا گیا۔ ایسی صورت میں قتل، قتلِ ناحق ہی ٹھہرایا جائے گا۔ قتلِ حق کا اختیار اسلامی حکومت کی صوابدید پر ہوگا جس کی وضاحت بھی قرآن نے تشنہ نہیں چھوڑی اور دوٹوک الفاظ میں اعلان کر دیا کہ:

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ۭ (17:33)

اور جس جان کا مارنا، خدا نے حرام قرار دیا ہے، اسے قتل مت کرو، سوائے اس کے کہ اس کو قتل کرنا قانون عدل کا تقاضا ہو۔ اور جو شخص ظلم سے ناحق مارا جائے تو، ہم نے قصاص کے لئے (نظام کے) وہ لوگ مقرر کیے ہیں، جو مقتول کی طرف سے بڑی قوّت و غلبہ رکھتے ہیں۔ نظام پر لازم ہے کہ قانون کی حدود کے اندر رہتے ہوئے قاتل کو اُس کے جُرم کے مطابق سزا دِلوائے۔

قتلِ ناحق جو غیرت وغیرہ کے نام سے کئے جاتے ہیں، اُس کی وضاحت قرآن نے تشنہ نہیں چھوڑی اور اُس کی غیر معمولی اہمیت بھی بیان کر دی کہ:

اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ (5:32)

یاد رکھو! جو کسی کو ناحق قتل کر ڈالے، سوائے اس کے کہ وہ جرم قتل کے قصاص میں ماخوذ ہو یا ملک میں فساد برپا کرنے کے جرم میں موت کی سزا کا مستحق ہو، تو بے گناہ قتل کے متعلق یوں سمجھو گویا اس قتل ناحق کرنے والے شخص نے ایک فرد کو قتل نہیں کیا بلکہ پوری کی پوری نوع انسانی کو قتل کر دیا۔

غیرت کے نام پر عورت کے قتل کی روش سے تو یہی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ غیرت کا ہتھیار بھی مکتبِ مُلّا نے مرد کی فحاشی کی سزا کو قطع نظر کرتے ہوئے صِرف اور صِرف عورت پر استعمال کرنے اور عورت کی کمتری کو ثابت کرنے کے لئے اپنے ہاتھ لے رکھا ہے۔ حالانکہ قرآن دونوں عورت اور مرد کو یکساں طور پر فحاشی سے روکنے کی ہدایت دیتا ہے اور زناء کے مُرتکب مرد و زن کو سزا بھی ایک جیسی دینے کا اعلان کرتا ہے۔

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۖ (24:2)

زانی عورت اور زانی مرد، دونوں کو سو سو کوڑوں کی سزا دو۔

زانیہ اور زانی کہہ کر جو بات کی گئی ہے، اس میں زنا بالجبر شامل نہیں ہے، کیونکہ زنا بالجبر میں تو عورت مجرم ہی نہیں ہوتی، اس لئے اس کے لئے سزا بھی نہیں ہے۔ یہاں زانیہ اور زانی کو ساتھ رکھنے سے مراد یہ ہے کہ یہ زنا بالجبر نہیں ہے، دونوں کی رضامندی شامل ہے۔

زناء کے جُرم اور اُس کی سزا سے بچاؤ کے لئے قرآن زانیہ اور زانی کو، کوڑے مارنے سے پہلے، وہ تمام راستے بند کر دیتا ہے، جو مرد و زن دونوں کو، زنا کی طرف لے جاتے ہیں۔ زنا تو ایک آخری فعل ہے، جس کا برا اثر زانیہ اور زانی کی ذات پر مرتّب ہو جاتا ہے، لیکن اس Event سے پہلے زنا کی اور بہت سی مبادیات ہیں، جو اس فعل کی طرف لے کر جاتی ہیں۔ قرآن انہیں ایک جامع لفظ فواحش سے تعبیر کرتا ہے۔ فحش کا ترجمہ ہمارے ہاں بے حیائی کیا جا سکتا ہے، یعنی جنسی جذبات کو ابھارنے والی جتنی چیزیں ہیں، ان سب کے لئے یہ لفظ ہے۔

سور (خنزیر) تو کوئی مسلمان نہیں کھاتا کہ اس کو قرآن نے سبھی کے لئے حرام کیا ہوا ہے، لیکن اس بات کو کوئی نہیں سوچتا

کہ فواحش کو بھی تو قرآن نے سور کی طرح سبھی زن و مرد دونوں کے لئے حرام کیا ہوا ہے۔ دیکھیے

اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ ۔۔۔۔۔(7:33)

اِس میں کوئی شک نہیں کہ میرے رب نے ہر قسم کی بے حیائی کی باتوں کو، خواہ کھلی ہوں یا پوشیدہ (عملاً ہوں یا ان کی دل میں آرزو) سب کو حرام قرار دیا ہے۔

ہمیں یہ ہرگز نہیں بھولنا چاہئیے کہ فواحشِ سے مرد و زن کو یکساں طور پر روکا گیا ہے، لہذا مکتبِ مُلا کا اِسے عورتوں پر مخصوص کر کے اُن کو کمتر ثابت کرنا بلا جواز ہے۔

گیارہویں دلیل:

عورتوں کے لئے حیض/عِدت کا ہونا اور مردوں کے لئے نہ ہونا۔

مردوں کی فضیلت اور عورتوں کے کمتر ہونے کی دلیل کے طور پر قرآن کی اُس آیت کا حوالہ دیا جاتا ہے، جس میں مرد کو عورت پر ایک درجہ فوقیت کی بات کی گئی ہے۔ لہذا اس آیت کا بھی سیاق و سباق میں تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا یَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ یَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِیْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ یُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِیْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۲۸﴾ (2:228)

اور مطلقہ عورتیں اپنے آپ کو (دوسری شادی کے لیے) تین حیض تک روکے رکھیں۔ اور اگر وہ قوانین خداوندی اور اخروی زندگی پر ایمان رکھتی ہیں، تو ان کے لیے جائز نہیں کہ اللہ نے ان کے رحموں میں جو کچھ پیدا کیا ہے، اس کو چھپائیں۔ اور اس عرصہ میں ان کے شوہر (باہمی رضامندی سے) ان کو لوٹانے کے زیادہ حق دار ہیں، بشرطیکہ وہ دونوں سازگاری کے طالب ہوں۔ اور ان عورتوں کے لیے دستور کے مطابق اسی طرح حقوق ہیں، جس طرح دستور کے مطابق ان پر ذمہ داریاں ہیں۔ ہاں مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ/ترجیح ہے (یعنی مرد کے لیے جس کا ذکر ہو رہا ہے، عدّت نہیں ہے)۔ اور یہ (ترجیح) اس خدا کے قانون میں ہے، جو ہر معاملہ کی حکمت سے واقف ہے اور ہر ایک کو اس کے صحیح مقام پر رکھنے پر قادر اور غالب ہے۔

یہاں لوگ عورتوں کے حیض آنے کو بھی اُن کی کمتر ہونے کی دلیل کے طور قرآن ہی کی آیت سے پیش کرتے ہیں کہ

وَیَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِیْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًی ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِی الْمَحِیْضِ ۙ (2:222)

وہ حیض کی حالت کے متعلق دریافت کرتے ہیں تو اُن سے کہہ دو کہ حیض کی حالت عورتوں کے لئے ایک تکلیف دہ امر ہے۔

تکلیف دہ امر کو برداشت کرنے کی صلاحیت سے نوازے جانے کی بنا پر عورت کے کمتر ہونے کی دلیل کے اخذ کرنے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ حیض کی مدت اس لیے مقرر کی گئی تا کہ جو کچھ رحم میں ہے وہ ظاہر ہو جائے اور جس کا بچہ ہے اس پر ذمہ داری ڈال کر بچے کے حقوق کا تحفظ کیا جا سکے۔

اس ایک درجہ کی تخصیص کر کے فوقیت کے ہرگز معنی یہ نہیں لئے جا سکتے کہ مردوں کو عورتوں پر ہر طرح سے فضیلت حاصل ہے۔ مرد کے لئے حیض/ عدت کی مدت نہیں رکھی گئی کہ بچہ کی پیدائش عورت کے پیٹ میں ہوتی ہے۔ اگر مرد کے پیٹ میں بچہ ہونے کا امکان ہوتا، تو اُسے بھی حیض/عِدت کے مرحلہ سے ضرور گذارا جاتا پورے قرآن میں بس یہی ایک آیت ہے، جس میں مرد کو عورت پر ایک درجہ فوقیت حاصل ہونے کی بات ملتی ہے۔

عام حالت میں حیض کی تین ماہ کی مدت کو عدت کہا جاتا ہے۔ اگر کسی کو سن رسیدہ ہونے کی وجہ سے یا بیماری کی وجہ سے حیض نہ آتا ہو، تو عدت کی مدت تین ماہ ہے اور حاملہ عورت کی عدت کی مدت بچے کی پیدائش تک ہے (65:4)۔ جس عورت کے ساتھ زنا شوئی نہ ہوئی ہو اور طلاق واقع ہو جائے، تو اس کے لیے کوئی عدت نہیں (33:49)۔ بیوہ عورت کی عدت چار ماہ اور دس دن ہے (2:238)۔ قرآن نے بیوہ کے متعلق تشریح نہیں کی کہ اگر وہ حاملہ ہو تو کتنی عدت ہے۔ لیکن حاملہ مطلقہ کی عدت سے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ بیوہ حاملہ کی عدت کی مدت بھی وضع حمل تک ہونی چاہیے۔

مُعترضین کا مردوں پر قرآن کی درجِ بالا اس آیت (2:228) درجِ ذیل کے حصہ سے اخذ کر کے مردوں کو عورتوں پر فوقیت رکھنے کی دلیل پیش کی ہے کہ

وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ط

مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ فوقیت حاصل ہے۔

قرآن کی اِس ایک آیت سے مرد کو عورت پر فوقیت سے یہ مراد لینا کہ اِس سے مرد کا عورت پر ہر لحاظ سے درجہ بڑھایا جا سکتا ہے۔ اس ایک درجہ کی تخصیص کر کے فوقیت کے ہرگز معنی یہ نہیں لئے جا سکتے کہ مردوں کو عورتوں پر ہر طرح سے فضیلت حاصل ہے۔ یہ کہنا کم فہمی پر مبنی ہوگا۔ یہ تو تقسیمِ کار کا فطری نتیجہ ہے جو عورت کو اولاد پیدا کرنے اور اُس کی پرورش کے لئے سونپا گیا ہے۔ ورنہ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ص (2:228) مرد اور عورت کے حقوق و فرائض یکساں ہیں۔

جب مساوات کی عمارت انسانی ذات کے عقیدہ پر استوار ہوتی ہے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی فرد اپنے مفاد کے حصول کے لئے آلہ کار نہیں بنایا جا سکتا یعنی کوئی فرد اپنے مفاد کے حصول کے لئے کسی دوسرے فرد کو بطورِ ذریعہ استعمال نہیں کر سکتا۔ اسے ہی حقیقی آزادی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس سے معاشرہ میں پائے جانے والے ذات پات، حسب و نسب اور رنگ و نسل کے تمام امتیازات بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ قرآنِ کریم کی رو سے جنسی تفریق بھی نہ وجہِ ذلت ہے نہ باعثِ امتیاز، یعنی نہ مرد، محض مرد ہونے کی حیثیت سے، عورتوں سے افضل ہے، اور نہ ہی عورتیں محض عورت ہونے کی بناء پر مردوں سے کمتر ہیں۔ مرد اور عورت کی ساخت میں جو فرق ہے، اس کا تعلق ان کے طبیعی وظائفِ حیات سے ہے۔ انسانیت کی سطح پر دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس میں عمل کا میدان دونوں کے لئے یکساں ہے اور عمل کے نتائج بھی یکساں۔

عربی زبان کی یہ خاصیت ہے کہ جب تک تذکیر و تانیث کو الگ نہ کیا جائے، Man (مرد) کے لئے He (وہ، مذکر)

کا صیغہ استعمال ہوتا ہے، لیکن اس کے اندر دونوں مذکر اور مؤنث آجاتے ہیں۔

پیدائش کے اعتبار سے تمام انسان یکساں طور پر واجبُ الاحترام ہیں، لیکن اس کے آگے احترام کے مدارج ان کے اعمال (کاموں) کے مطابق مرتب ہوں گے۔

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (46:19)

ہر ایک کے مدارج ان کے اعمال (کاموں) کے مطابق مرتب ہوں گے۔

آگے اعمال کے معیار کی وضاحت بھی کر دی کہ

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (49:13)

تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ واجبُ التکریم وہ ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ شعار (قوانین کی نگہداشت کرنے والا) ہے۔

اِس ایک معیار نے سبھی دوسرے طاقت، دولت اور جنسی معیار کے بل بوتے پر استوار کئے انسان کے درجات کی جڑ اُکھاڑ کر رکھ دی۔ اِس معیار سے عِدت کی پابندی نہ ہونے کی وجہ سے مرد کا درجہ بلند ہونے کی دلیل مضحکہ خیز لگتی ہے۔

بارہویں دلیل:

نسل کا باپ کے نام کے حوالہ سے آگے بڑھنا۔

عورتوں کے لئے یہ جاننے کے لئے کہ پیٹ میں کہیں شوہر کی نسل تو نہیں پَل رہی، عورت کے لئے بنیادی طور پر عِدت کا تصور قرآن نے متعارف کرایا ہے۔ اِس سے منطقی طور پر اخذ کیا جاسکتا ہے کہ نسل باپ کی طرف سے آگے بڑھتی ہے، لہٰذا مرد کو عورت پر فضیلت اور اُس کے مقابل عورت کے کمتر ہونے کا ثبوت مِل جاتا ہے۔ ایک لمحہ کے لئے اگر ہم اِس نظریہ سے مُتفق بھی ہو جائیں کہ نسل مرد کے نام سے آگے بڑھتی ہے، تو کیا اِس نسلی تفاخر سے مرد کی برتری اور عورت کی کمتری مقصود ہوتی ہے؟

اِس کا قرآن کی روشنی میں تجزیہ لیتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ نسلی تفاخر کا عقیدہ کُفر کا عقیدہ ہے۔ لہٰذا اس کا تفصیلی جائزہ لینا ضروری ہو جاتا ہے۔

نسلی تفاخر کے مسئلہ کا آغاز آدمیت کے نمائندہ آدم کی آمد سے ہو گیا تھا، انسان مرنا نہیں چاہتا، لیکن موت برحق ہے تو شیطان نے وسوسہ یہ ڈالا کہ اولاد کی صورت میں مرنے کے بعد تمہارا نام اولاد سے چلے گا اور یوں تم اولاد کے ذریعے حیات جاوِداں (الْخٰلِدِيْنَ) حاصل کر سکتے ہو۔ اس لئے اب تم اپنی اولاد سے اپنا کنبہ، اپنا خاندان اور قبیلے بناؤ۔ اس طرح تمہارا سلسلہ قیامت تک کے لئے چلے گا۔

پھر دُہرایا جاتا ہے کہ کفر کا نظریہ یہ ہے کہ انسان کی بقاء اُس کی اپنی نسل سے ہوتی ہے، لہٰذا اولاد کی منفعت کے لئے،

جو کچھ کیا جائے، وہ سب جائز اور درست ہوتا ہے۔

اس کے برعکس قرآنی نظریہ کی حامل قوم کا مسلک یہ ہوتا ہے کہ ہر طاقتور کا فریضہ ہوتا ہے کہ وہ کمزور کی حفاظت اور پرورش کرے، اور اگر وہ ایسا نہ کرے، تو اس سے اس کی باز پُرس ہوگی۔ کفر کا نظریہ یہ ہے کہ اپنی قوم کی منفعت کے لئے، جو کچھ کیا جائے، وہ سب جائز اور درست ہوتا ہے۔ لیکن ایمان پر مبنی نظریہ ہے کہ:

وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ط (13:17)

وہی نظریہ، وہی نظام، وہی عمل باقی رہ سکتا ہے، جو کسی خاص گروہ یا خاص قوم نہیں، بلکہ پوری نوع انسان کے لئے منفعت بخش ہو۔

یہ اصول قرآن کا مرکزی یا بنیادی نظریہ ہے۔ باقی تمام تصورات کے متعلق بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ اِسی بنیادی نظریہ کی حدود میں بیان کئے گئے ہیں۔ کُفر کی قومیت کا نتیجہ یہ ہے کہ جو شخص اپنی قوم کے فائدے کے لئے، دوسری قوموں کو جتنا زیادہ لوٹے، وہ اتنا ہی زیادہ محبِ وطن (Patriot) اور واجب التکریم سمجھا جاتا ہے۔

اِس تصور کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ نبی یہ پیغام لے کر آتا تھا اور اسے الاسلام کی طرف دعوت سمجھا جاتا تھا۔

انبیاء کی طرف سے نسلی تفاخر کا ردّ:

قرآن نے انبیاءؑ کے حالات بتاتے ہوئے آغاز میں حضرت نوحؑ کا ذکر کیا ہے۔ قرآن پہلے نبیؑ سے لے کر آخری نبیؐ کی زبان سے نسلی تفاخر کے ردّ کو الدین یا الاسلام کی تعلیم کہہ کر متعارف کراتا تھا۔ انبیاء کرامؑ نے اس معیارِ تفریق کو محض نظری طور پر پیش نہیں کیا بلکہ اپنی زندگی میں اس پر عمل پیرا ہو کر دکھا بھی دیا۔ سلسلۂ وحی کا آغاز حضرت نوحؑ سے ہوتا ہے۔ حضرت نوحؑ نے اپنے بیٹے کو ہلاک ہوتے دیکھا، تو اسے اپنا اہل سمجھتے ہوئے، خدا سے مدد کی درخواست کی تو اُن کو کہا گیا کہ:

قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ط اِنِّيْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝ (11:46)

اِس پر خدا نے کہا کہ اے نوح! (تو نے اہل کا صحیح مفہوم نہیں سمجھا۔ وہ بے شک تیرا بیٹا ہے) لیکن تیرے اہل میں سے نہیں ہے، اور اُس کے اعمال غیر صالح تھے۔ لہٰذا تجھے اِس بات کا مطالبہ نہیں کرنا چاہیے، جس کا تجھے علم نہ ہو۔ میں تجھے اِن باتوں کی نصیحت کرتا ہوں کہ تو حقائق کے علم سے جاہل نہ رہے۔

اِسی طرح حضرتِ لوطؑ سے کہا گیا کہ تیری بیوی بھی تیرے اپنوں میں نہیں کیونکہ وہ اُن کی جماعت میں داخل نہیں ہوئی تھی، تو یہ بات بھی اِس اصول کی بنا پر کہی گئی۔

فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۖ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝ (7:83)

تو ہم نے اس کو، اور اس کے پیروکاروں کو بچا لیا، سوائے اس کی بیوی کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی۔

اسی طرح جب حضرت ابراہیمؑ نے پہلے اپنے باپ اور پھر ساری قوم، جنہوں نے خدا کو چھوڑ کر دوسروں کی معبودیت اختیار کی تھی سے بے زاری کا اعلان کرتے ہوئے ان سے کہا:

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۡ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ (60:4)

تمہارے لئے ابراہیم (علیہ السلام) اور اُس کے رُفقاء کا طرزِ عمل، نہایت عمدہ نمونہ ہے۔ انہوں نے اپنی قوم سے (جن سے اُن کے خون کے رشتے تھے) اعلانیہ کہہ دیا کہ ہم تم سے، اور جن کی تم نے خدا کو چھوڑ کر معبودیت اختیار کر رکھی ہے، اُن سے سخت بیزار ہیں۔ ہم تمہارے غلط مسلک کا یکسر انکار (کفر) کرتے ہیں۔ اِس بنا پر تم میں اور ہم میں ہمیشہ کے لئے دشمنی اور عداوت رہے گی، تا آنکہ تم خدائے واحد پر ایمان نہ لاؤ۔

اس کے برعکس انہوں نے اعلان کیا تھا کہ میرے اپنے وہ ہیں، جو میرے اتباع میں خدائے واحد کی اطاعت کرتے ہیں۔

فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ (14:36)

میرا اپنا وہ ہوگا جو اُس مسلک کا اتباع کرے گا جس پر میں چلتا ہوں۔

اِسی نسل کے ضِمن میں اولاد کے متعلق تنبیہ بھی کی گئی ہے کہ اپنی اولاد کی فضول خرچیوں کے لیے یا ان کے لیے جائیدادیں بنانے کی خاطر، ناجائز طریقوں سے کمائی کرنا بھی بہت بڑا جرم ہے۔ اس قسم کی اولاد یا بیویاں (جن کی خاطر انسان کو ناجائز طریقے سے کمائی کرنی پڑتی ہے) انسان کی دشمن ہوتی ہیں۔

7۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ (64:14)

تمہاری بعض بیویاں اور بچے ایسے بھی ہوتے ہیں، جو تمہارے دشمن ہوتے ہیں۔ لہٰذا ایسے بیوی بچوں سے بہت بچنا چاہیے۔

لہٰذا خود بھی حلال وطیب کمائی کھانی چاہیے، اور اپنے بچوں کو بھی رزقِ حلال کھلانا چاہیے، اور ان کی صحبت، تربیت اور تعلیم کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے۔

لہٰذا نسل اگر باطل پر ہو تو وہ انسان کی بقاء کرنے کی بجائے، اُسے تباہ کرنے کے درپے ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اللہ نسل کو قرآن میں کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ لہٰذا اِس نسلی بقاء کے تصور کی بنیاد پر نہ تو مرد کو عورتوں پر فضیلت ہونے کا اور نہ ہی عورت کو مردوں سے کمتر ہونے کا ثبوت مِلتا ہے۔

تیرہویں دلیل:

عِدت کے دوران کا عرصہ بیوی کا گھر میں محبوس ہونا۔

یہاں عورت کی پوزیشن کو کمتر ثابت کرنے کے لئے عورت کے لئے عدت کے دوران شوہر کے گھر میں محبوس رہنے کی دلیل پیش کی جاتی ہے۔ لہذا اس کا تجزیہ بھی لیا جاتا ہے۔

عدت کے دوران مطلقہ عورت کے رہنے سہنے اور خورونوش کی ذمہ داری، طلاق دینے والے شوہر پر بطورِ قوامون فریضہ کے تحت رکھی گئی ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۭ (2:240)

تم میں سے جو لوگ عورتیں چھوڑ کر مر جائیں، وہ اپنی زندگی ہی میں اپنی بیویوں کے متعلق وصیت کر جائیں کہ سال بھر تک انہیں گھر سے نہ نکالا جائے، اور انہیں سامان زندگی دیا جائے۔ لیکن اگر وہ خود چلی جائیں، اور دستور کے مطابق اپنے لیے فیصلہ کر لیں، تو اس سے تم پر کوئی الزام نہیں آتا۔

آگے ہدایت کی گئی ہے کہ خورونوش اور رہنے سہنے کا معیار وہی ہوگا جیسا بیوی ہوتے ہوئے تھا۔

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ (2:241)

اور مطلقہ عورت کو بھی عدّت کے عرصہ میں دستور کے مطابق سامان زندگی بہم پہنچانا ہے۔ یہ اُن لوگوں کے لئے واجب ہے جو مُتقین ہیں۔

لیکن اگر حالات سازگار نہ ہوں تو عورت، عدت کے دوران کسی دوسری جگہ بھی جا سکتی ہے۔ بیوہ کے لیے زندگی ہی میں مرد اپنے ترکہ میں سے وصیت کرے گا کہ اس کی بیوی کو ایک سال کا خورونوش اور رہائش دی جائے۔ اگر بیوہ اپنی مرضی سے کہیں اور چلی جائے تو پھر ایک سال کا خورونوش اور رہائش کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے (2:240)۔

روایات کی رو سے مکتبِ مُلاعِدت ہو یا نہ ہو، عورتوں کے متعلق عقیدہ رکھتا ہے کہ

عورت کا گھر سے باہر نکلنا:

5۔ ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''عورت پردہ ہے اور عورت جب گھر سے باہر نکلتی ہے تو شیطان اسے جھانکتا ہے۔ عورت کے لئے اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ تقرب یہ ہے کہ وہ گھر کے کسی گوشہ میں رہے۔''

(ترمذی۔ طبرانی۔ کنز)

عورتوں کا تنہا سفر کرنا:

6۔ ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کوئی عورت سفر نہ کرے ہاں مگر یہ کہ اس کے ساتھ اس کا محرم ہو۔'' (طحاوی۔ بخاری)

یہ جو کہا گیا ہے کہ بیوہ اسی گھر میں عدت کا عرصہ گزارے، تو یہ بیوہ کے لیے سہولت کا بیان ہے، نہ کہ سزا دی گئی ہے۔ یہ

جو ہمارے ہاں رواج کے طور پر کہا جاتا ہے کہ جس گھر میں خاوند مرے، اسی گھر میں بیوہ چار ماہ دس دن اپنے آپ کو بند رکھے، تو یہ غلط ہے۔ پابندِ گھر رکھنا تو ایک سزا کے طور پر متعارف کرائی گئی ہے جو قرآن نے سورۃ النسآء میں فحش عورتوں کے لیے تجویز کی ہوئی ہے (4:15)۔ کہا تو یہ گیا ہے کہ بیوہ کو ایک سال تک گھر سے نہ نکالا جائے، لیکن اگر بیوہ کے لیے متوفی کا گھر سازگار نہ ہو، تو وہ کسی اور سازگار جگہ بھی جا سکتی ہے۔ ہمارے ہاں تو بیوہ کو گھر سے باہر قدم بھی نہیں رکھنے دیتے۔ یہ قرآن کا منشا نہیں ہے۔ مطلقہ کے بارے میں قرآن نے تو صرف یہ کہا ہے کہ اس دوران عورت کسی جگہ شادی نہیں کر سکتی۔

لہٰذا یہ دلیل دینا کہ عِدت کے دوران قرآن عورت کو گھر میں محبوس رہنے کی ہدایت دیتا ہے، نہ صرف جھوٹ پر مبنی ہے بلکہ قرآنی تعلیمات کے منافی ہے۔ لہٰذا اِس سے عورت کے درجہ کو مرد سے کمتر ثابت کرنے کی کوشش کرنا بلا جواز ہے۔

البتہ عدت کے دوران اگر مرد اور عورت میں حالات سازگار ہو گئے ہیں تو مرد کو یہ حق زیادہ حاصل ہے کہ وہ اپنی مطلقہ عورت کی طرف رجوع کرے اور پھر سے میاں بیوی کی طرح رہنے لگیں بشرطیکہ دونوں خوش اسلوبی کے ساتھ رہنا چاہیں (4:19)۔

چودھویں دلیل:

عورت کو یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ عندالضرورت کسی اہل کتاب مرد سے نکاح کر سکے۔

معترضین مرد کا درجہ بڑھانے اور عورت کا کمتر ہونے کی یہ دلیل بھی پیش کر دیتے ہیں کہ قرآن کی رو سے مرد تو اہلِ کتاب کافر عورت سے بوقت ضرورت نکاح کر سکتا ہے، لیکن عورت کو یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ عندالضرورت کسی اہل کتاب مرد سے نکاح کر سکے۔ لہٰذا اِس دلیل کا بھی قرآن کی روشنی میں تجزیہ کیا جانا ضروری ہو جاتا ہے۔

قرآن میں ہے کہ:

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۖ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۫ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ؕ (5:5)

اب تمہارے لئے پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئی ہیں، اور اہل کتاب کے ہاں کا پاکیزہ کھانا تمہارے لئے حلال ہے بشرطیکہ وہ تمہارے ہاں حرام نہ ہو۔ اور تمہارا کھانا ان کے لئے حلال ہے۔ اور تمہارے لئے مومن پاکدامن عورتیں اور اہل کتاب، جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی، کی پاکدامن عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں، بشرطیکہ ان کو بند نکاح میں محفوظ کر کے ان کے مہران کو دو، بدکاری اور یاری آشنائی لگانے کے لئے حلال نہیں ہیں۔

اِس میں شک نہیں کہ اہلِ کتاب اور مومنین کے خیالات میں یکسانیت نہیں پائی جاتی، جو نکاح کے لئے ضروری ہوتی ہے لیکن قرآن یہاں یہ بھی وضاحت کر رہا ہے کہ

وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ۝ (3:110)

اگر اہل کتاب بھی ان قوانین کی صداقت پر ایمان لا کر ان کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیں، تو یہ ان کے لئے بہتر ہوتا (اور یوں وہ بھی خیر امّت کا جزو بن جاتے)۔ ان میں سے کچھ تو اس پر ایمان لائے ہیں، لیکن اکثریت غلط راستوں پر چل رہی ہے۔

یہود و نصاریٰ، رسول اللہ ﷺ کے دور میں ویسی ہی مذہبی پوزیشن میں تھے، جیسے آج ہم ہیں، یعنی اصل دین سے ہٹے ہوئے۔ یہود و نصاریٰ کے پاس خدا کی اصل کتاب نہیں ہے، وہ اپنے پاس کتاب کی رو سے خدا کے نظام کی طرف نہیں آ سکتے۔ ہم مسلمانوں کے پاس تو خدا کی اصلی کتاب ہے، لیکن ہم بھی اصل اسلام سے ہٹے ہوئے ہیں۔ لہٰذا، قرآن اہل مذاہب بشمول مسلمانوں سے کہہ رہا ہے کہ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ (3:110) اگر یہ اہلِ کتاب (اہل مذہب) اس قرآن پر ایمان لے آئیں اور اس کے مطابق زندگی بسر کریں تو لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ ان کے لئے بھی وہی خیر لفظ استعمال ہوا ہے، جو جماعت مومنین کے لئے استعمال ہوا ہے کہ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ تمہارے ہی لئے بہتر ہوگا یعنی ہمارے ہی لئے بہتر ہوگا۔

خیالات میں پوری یکسانیت نہ ہونے کے باوجود مومن مردوں کو اہلِ کتاب کی پاکدامن عورتوں (جن کا قرآن پر ایمان لانے کا اغلب امکان ہوتا ہے) سے ضرورت محسوس ہونے پر باہمی رضامندی سے شادی کی اجازت دی گئی ہے۔ اِس سے فطرتی طور پر دونوں کے لئے مُشکلات پیدا ہوتی ہیں، جن پر قابو پانے میں محنت کرنی پڑتی ہے اور وہ بڑی اکثریت سے کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ عورتوں کو اِس مرحلہ سے دور رکھ کر واضح پیغام اور سہولت دی گئی ہے کہ وہ پوری دلجمعی سے اولاد کی پیدائش اور اُس کی تربیت کر کے ایک اُمّہ تیار کرنے کے فریضہ سے کسی حالت میں غفلت کا مظاہرہ نہ کرے۔ یہاں مرد اور عورت کے درمیان تقسیمِ کار کے اصول کے تناظر میں بیوی کے فرائضِ منصبی کی اہمیت بتانا مقصود ہے اور اِس سے مرد کی برتری و عورت کی کمتری کا تصور اخذ کرنا بِلا جواز ہے۔

پندرہویں دلیل:

قرآن سے شوہر کے بیوی کو مارنے کی اجازت ہونا۔

عدت کے سلسلہ میں مرد کے لئے ایک درجہ فضیلت حاصل کرنے کے نتیجہ میں مکتبِ مُلا کی اختراع سے قرآن کے حوالہ سے یہ دعوٰی سامنے آتا ہے کہ شوہر کو بیوی کو ہلکی مار تک کا اختیار دے دیا گیا ہے۔ لہٰذا یہاں حقیقت تک رسائی کے حصول میں اِس دعوٰی کا تجزیہ لیا جاتا ہے۔

شوہر کے بیوی کو مارنے کی حقیقت کا قرآن کی روشنی میں جائزہ:

اِس ضِمن میں وہ اپنے دعوٰی کو ثابت کرنے کے لئے قرآن کی درجِ ذیل آیت کا قرآنی تعلیم کے منافی مطلب نکال کر سہارا لیتے ہیں۔

وَالّٰتِیۡ تَخَافُوۡنَ نُشُوۡزَهُنَّ فَعِظُوۡهُنَّ وَاهۡجُرُوۡهُنَّ فِی الۡمَضَاجِعِ وَاضۡرِبُوۡهُنَّ ۚ فَاِنۡ اَطَعۡنَكُمۡ فَلَا تَبۡغُوۡا عَلَيۡهِنَّ سَبِيۡلًا ؕ (4:34)

اِس کا روایتی ترجمہ شوہروں کا بیویوں کی طرف سے بدخوئی کی صورت میں یوں کیا جاتا ہے کہ

اور جن کی بدخوئی کا ڈر ہو تُم کو تو اُن کو سمجھاؤ اور جدا کرو سُونے میں اور مارو۔ پھر اگر کہا مانیں تُمہارا تو مت تلاش کرو اِن پر راہِ الزام کی۔

روایات کی رو سے البتہ بیویوں پر کمال مہربانی کا ثبوت دیتے ہوئے شوہروں کو مار کو خفیف رکھنے کی حکومت کے ادارہ اسلامی نظریاتی کونسل نے سفارش کی ہے۔ خفیف کی البتہ وضاحت شائد اس لئے نہیں کی کہ اُسے شوہر کی صوابدید پر چھوڑنا مقصود ہو۔

وَالّٰتِیۡ تَخَافُوۡنَ نُشُوۡزَهُنَّ کا مفہوم:

یہاں میاں بیوی کی بات نہیں ہو رہی ہے۔ بات الرجال اور النسآء کی ہو رہی ہے اور معاشرے سے جمع کے صیغے میں کہا جا رہا ہے کہ اگر تمہیں کسی ایک عورت کی طرف سے یا عورتوں کی طرف سے اندیشہ ہو کہ وہ اپنے فرائض منصبی کے تحت بچوں کی نگہداشت نہیں کر رہی ہیں، جس کی وجہ سے یا ان کے منفی رویہ کی وجہ سے گھر کا ماحول صحت مند نہیں رہا تو **فَعِظُوۡهُنَّ** معاشرے کی حکومت انہیں سمجھائے گی، نصیحت کرے گی کہ باز آ جاؤ۔ یہ خاوند کو نہیں معاشرے کو یعنی حکومت کو حکم دیا جا رہا ہے۔

(جاری ہے)

سانحہ ارتحال

نہایت دُکھ کے ساتھ اطلاع دی جاتی ہے کہ محترم محمد افتخار الحق صاحب بزمِ طلوع اسلام کراچی کے قدیمی رُکن وفات پا گئے ہیں۔ مرحوم ایک علمی و ادبی شخصیت اور وسیع مطالعہ کے حامل تھے۔ عمر بھر قرآنِ کریم سے متمسک رہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور پس ماندگان و اعزہ و اقرباء کو صبر کی توفیق دے۔ ادارہ مرحوم کے اہلِ خاندان و احباب کے دُکھ میں برابر کا شریک ہے۔

رسالہ نہ ملنے کی صورت میں مندرجہ ذیل نمبرز پر رابطہ کریں شکریہ
Cell: 0321-4460787 Phone: 042-35714546

Manzil ba Manzil **(منزل بہ منزل)**

Chapter 4: Builder of Kaaba (*Mei'mar Haram* - معمارِ حرم) –

To leaders of Spring's caravan

(Tulu-e-Islam Convention, April, 1960)

By G. A. Parwez

In gathering of believers, I know this is what delights me?
One brotherhood, one Iman, one path, and one mission!

My dear brothers, *Assalaamu Alaikum wa Rahmatullah*!

Immediately after the celebration of *Eid-ul-Fitr* – what we call "*Jashn-e Nuzul-e Quran*" (the celebration of the revelation of the Quran) – to be gathered together here in shining setting like this suffused with fragrance of deep love has created deep happiness in our hearts and minds, as if this beautiful environment of the convention hall is whirling with joy and saying:

Who has graced this gathering of exquisite love and magnificence?
That has made the entire environment turn into youthful exuberance!

Let me first offer my heartfelt congratulation to you on the occasion of this happy gathering. Gatherings like this, in fact, make my desires young and my feelings warm; and they invigorate my emotions, and strengthen my determination in my Quranic Journey. So, I am deeply thankful to you with all my heart and sincerity!

My dear friends, from our point of view, the most important event of last year has been the formation of a constitution commission charged with proposing recommendations for a new constitution of the state of Pakistan. This is the constructive step after the destructive step that was taken about one and half years ago when the Martial law authorities declared the current constitution null and void. The formation of the commission is the beginning of this constructive step. After the creation of Pakistan the framing of its constitution was handed to the constituent assembly. That assembly was not a true representative of the people of Pakistan, and so, the people of Pakistan didn't have any say in the creation of the constitution that was adopted then. The current commission has declared that it will issue a questionnaire to people of Pakistan to get their input regarding the type of constitution they want. The questionnaire has not been issued yet. So we cannot say whether it will be limited to asking people's opinions about only the constitution's basic principles or will it also include some details about the proposed constitution. But even if it is limited to only the basic principles it will be sufficient for the goal that we have in front of us. It is because our belief is that the constitution of the state must be according to the Quranic outlines. The Quran provides the permanent principles within which details can be worked out. So, if our

proposed constitution is according to Quran's basic principles then there is no need to worry about the details.

What is the importance of constitution to a state? – About this you are quite well aware of. And there is no need to go into details about it. A state's constitution is the lifeblood of its citizens. It impacts not only the present generation but the future generations as well. This is the case with any constitution. But the importance of the Quranic constitution for a state goes much beyond this – it turns that state into a model state for the entire world. It tells the world by perceptual means that when social life of humans is molded on the Quranic pattern then how the world becomes heaven on earth? This is our conviction – and this conviction is based on reason and deep understanding – that if Quranic constitution becomes the state constitution of Pakistan then other nations of the world would leave their systems and will adopt the Quranic system by seeing its shining results. And the heaven once again will see the scene of: يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۙ (110:2) – People joining the Divine Order in groups, one after the other.

When the passionate devotee rose up carrying the cup of Iman's elixir;
Then everyone started shouting: Bring it first to me, bring it first to me!

My friends, everyone can realize that the nation is going through a critical period now. But this is not the case only with Pakistan. It is no secret that great powers are also going through distress, anguish, and trail and tribulations. Their nature of difficulties and troubles may be different compared to weaker nations but they are facing their own challenges and difficulties nonetheless. So, nowhere there is peace and tranquility. The authorities in Pakistan are trying their best to improve the situation but they are facing hardship and difficulties at every step. The society has become so degraded and corrupted and the problems so numerous and challenging and so out of control that they seem impossible to solve. But these problems cannot be solved individually. The root cause of all the symptoms is only one. There is no need to put ointment on every boil of the smallpox. The solution is to attack the root cause of the disease with proper prescription. That is, the disease of the human society can be cured only with prescription of the absolute Creator. So, instead of trying to treat umpteen boils of the smallpox of the Pakistani society, we appeal to the official authorities to adopt the Quran as the single prescription. They will see then how these thousands of symptoms get cured with this single prescription. The Quran has sketched the picture thus of the world at the time of its revelation: ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (30:41) – there was chaos and disorder everywhere in land and water – i.e., there was chaos in walks of life. Nothing was at its proper place. The Prophet (PBUH) did not treat the individual

symptoms of the sick society. He established a state and enforced the Quranic constitution in it; and all the symptoms automatically disappeared. In fact, the humanity saw a life of such accomplishment and wellbeing that is unparalleled in human history. This is the Sunnah of the Prophet (PBUH) and that is the role model for us. Let the Quranic constitution get enforced in the state of Pakistan and you will see how the environment turns into a lively season of spring from its eternal dead season of fall:

Don't worry O devotee; let the spring come!
Heaven will spread, flowers will blossom!

This is how heavenly society is created on Earth: كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ (2:73) – thus Allah turns dead into alive if only you could use your intellect to observe His signs.

But my dear friends, the biggest responsibility falls on you in this regard. At this time only from your side the voice of the Quran – as *the* constitution of life – is being raised not just in Pakistan but in the entire world. The Nature had graced this great gift in your hands. But, for this, the Nature demands great sacrifice. It never reveals its heavenly pearls of gifts without extracting a huge price in terms of perseverance, hard work, and relentless struggle. When it opens the beast of a fortunate person then it loads him up with backbreaking burden of responsibility whose interpretation is summed up by these verses: اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۙ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۙ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۙ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ؕ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۙ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ؕ (93:1-6) – O Prophet (PBUH)! This strengthened your heart so much that difficulties which seemed almost impossible to overcome started appearing to be easily surmountable. You became much more courageous and your spirits soared. At this time in the initial stages of this program when you alone had to face tremendous hardships your back almost gave way with the weight of responsibilities. However, gradually the number of your companions increased due to which your burden lessened. Initially nobody was prepared to listen to you seriously. Instead all kinds of accusations and ridicule were hurled at you, causing much distress and anxiety. But gradually the situation changed and now your very name is being mentioned with dignity and reverence. Your fame has spread to far-off places and the message of Quran has attained an exalted position. The earlier hardships of life in Makkah were eased by the advent of Hijrah. Now the opponents have started waging wars against you. This has created new difficulties, but you will see that even after these hardships there shall be ease and comfort. This in fact is a principle of life, that for those who in the beginning face hardships with fortitude and steadfastness, later on there shall be ease and comfort.

This is a path of passionate love in which:

The more the difficulties keep on increasing in the seeker's way;
The more his heart is sure of reaching the destination of his way!

One should increase one's speed the more difficult the impediments one finds in his way of Quranic journey. This is the way for which it has been said:

Increase the pitch of your melody if its taste does not seem sweeter;
O rider! Increase the sound of your voice if howdah seems heavier!

But there is one prerequisite for travelling on this path: one cannot travel on this journey by using only emotion. The fact is that an emotional personal cannot accompany on the Quranic journey. The Quran has described its path as الْعَقَبَةُ (*Al-'Aqabatu*) – that is, to climb a hill. The only role emotion plays in climbing a hill is to provide a firm determination that, yes, I want to climb the hill. After that the phase of extreme patience, perseverance, and fortitude begins. The way up the hill can be covered only by advancing step by step. One cannot run to the top of the hill. Therefore, there is no place of emotion during the course of this journey. Courage, determination, and self-restraint – these are qualities that will arm you in your conviction to continue this journey. Whether or not one reaches the final goal – the top of the Quranic hill, i.e., the establishment of the Quranic society – in one's lifetime is not important. One should not even entertain this thought in one's mind – to see the final goal. The important thing is that one needs to continue this journey nonstop – so much so that even the leader of the passionate human caravan, the Prophet (PBUH) was told: وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (13:40) –O Prophet (PBUH), you might wonder whether the end of which your opponents are being warned will come about in your life time or whether you will spend your whole life in these struggles. The end will come according to Our Law of Requital. Your responsibility is only to communicate the message with full confidence that they will be recompensed for their actions since it is Allah Who keeps a watch over what they do.

There is no doubt that the results of this continuous struggle had started to appear during the lifetime of the Prophet (PBUH) but there were many companions who did not see the heavenly results of their struggle in their lifetime. In their share was only sacrifice after sacrifice – and the ultimate sacrifice of life. These companions could not see the fruit of their sacrifice during their lifetime. But the value of their sacrifice in the eyes of Allah was much more than those who joined the struggle later and saw the fruits of their struggle with their own eyes: لَا يَسْتَوِیْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ؕ (57:10) – Remember that those who strive for the establishment of the Divine Order without waiting for its results and accordingly keep their wealth open and available; and if required come out on to the battlefield – they

certainly are "pioneers". Their status is higher than those who join this Order after it has been established and they have seen the results. In other words, those who had kept their wealth open even before this system was established and were ready to die for it, cannot just be equal to those who did so afterwards. They are: وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ – They were first and foremost in accepting Islam; and their rank is very high.

Therefore, my dear friends, do not be disappointed if the results of your efforts do not appear in front of your eyes. This road is quite long and the goal extremely difficult. If such thoughts are popping up in your mind that "we have been working so hard but the results are not appearing," then know that you have really not understood the Quranic movement. On the part of the pioneers in this movement there is only continuous struggle, difficulties, and only more difficulties. They only sow the seeds of the Quranic thought and who knows who will harvest the crop. As for what we will get out of this continuous struggle – this is not something that can be explained rationally but can only be felt in the heart. Those who have this feeling know what the results are for treading on the path of truth and reality? They get a higher feeling in traveling itself on this path than would be the case in reaching the destination.

Throbbing, and not reaching the end, has its own taste;
Be happy that you're travelling behind the howdah of Layla!

The conviction in the truth of one's goal; belief in the proper way to reach that goal; and the company of trustworthy, sincere, and committed travelers – these are the treasures by themselves in the Quranic journey; so, what more one could wish for?

Don't be sad that the bud is new; it is the beginning of the garden what more do you wish?
There's river's edge, flowery garden, chirping birds; cool breeze, morn's dew, and melody!

The Quran reminds: ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (3:14) – that is the treasure of worldly life. And: وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى (87:17) – the Hereafter is better and everlasting. Tell your opponents: You give preference to the worldly gains of this physical life, although future gains would be better and everlasting. In other words, when you have to choose between physical needs and permanent values, then the proper behavior would be the preservation of the latter. Physical needs should be sacrificed. This will nourish and develop human self; and future life would be eternal and successful.

My dear friends, as I mentioned, this is an extremely challenging time for you. I think that the law commission won't take much time in proposing its recommendations. You don't have much time and there is lot of work to do.

The program in front of you is that prorogate this Quranic thought as much as possible. I have compiled the principles of Quranic constitution in one pamphlet. Please make this and other pamphlets available to as many hands as possible. And those who agree with Tulu-e-Islam's position on the constitution after due thought and proper understanding, then please tell them to provide their feedback via the questionnaire to the law commission; and tell them to also provide this information to the government as well. If this Quranic voice could reach the law commission and to government official from every corner of Pakistan then it will be a great success on your part. This is an age of democracy. When a democratic and constitutional step is taken regarding an issue then it is going to produce result. I have so much faith in the truth of this message it is as if I see its success with my eyes:

My constant heartfelt ache will create strong inspiration;
Every individual of this nation will be filled with passion!

In this connection there is one more thing worth noticing. As you would have seen in the editorial of the April 1960 issue of the Tulu-e-Islam magazine, the age of self-created religion is disappearing. Demands of time are moving fast by trampling over any life-system that cannot keep pace with time. And Pakistan cannot remain unaffected by this environment. It is the result of this that (especially) the educated youth are turning away from religion. If the Quran's voice could reach them at this time then they will come to the دین (*Deen*) by deserting religion. Otherwise, they will land in lap of atheism or communism. And you can very well imagine what the result will be then. If you see from this point of view then also it is extremely important to spread the Quranic thought. In this audience there are many whom I know would have gone – God knows where by being fed up with religion – if the Quran's thought had not reached them.

If the Quran's voice wasn't available to those coming out of temples and mosques;
Then the suffering and snubbed human beings, God knows where would have gone?

Therefore, my dear friends, the responsibility for showing the way to those fed up with religion has fallen on your shoulders. There is no group at this time besides yours that is delivering the message of the pure دین (*Deen*) of Allah. But this is not something that everyone can do:

The treasure of love is not meant for everyone; Love is not conducive for everyone to work for!
Tulips will go to those who have aching-heart; the heart of the diamond is without the fiery fire!

Leave aside inviting them to the pure دین (*Deen*) of Allah, the majority of the people are not even willing to listen to the Quran, thanks to our religious priesthood. If you go to them with the message of the pure Quran they say:

We feel very peaceful in the darkness of the night;
Don't mention before us, the shine of morn's light!

But due to loud cry of bats, the sun does not stop rising. It does rise with full sunshine on its appointed time. The demands of time are telling clear and loud that it is time for the dark night to disappear into the blazing light of the morning's sunshine:

The time for lifting the curtain before the public has arrived!
The mystery hiding behind the curtain will surely be revealed!
The time has passed now that believers used to invite secretly;
The entire world will be its realm, everyone will be a believer!

يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (61:8) – Do you think that with such attitude and actions you can extinguish the Divine Light (the Quran)? You can never succeed in your designs. Just imagine! Can they ever extinguish the light of the sun by just blowing at it? Allah is determined to make His light perfect and make it spread all over the world, regardless of how much the non-believers may detest it (9:32).

****

My dear friends, when I say that the grip of religion is getting looser then I am only stating a fact of life; and it is not my fantasy. But please understand that by "religion" I mean self-crafted ideologies and beliefs, not the revealed دین (*Deen*) of Allah. History tells us that whenever the influence of one religion diminished anywhere another religion filled the vacuum. But the disgust of religion per se at such a large scale that is happening now had never occurred before in the history of humankind. This is a clear proof that humanity is coming out of its childhood phase and entering its adulthood stage. Now, human beings cannot be frightened by the will-o'-the-wisp superstitious beliefs nor can it be entertained by ambiguous toys of hopes. Now, humans demand proofs and logic about the truth of every claim; and tend to accept it on the basis of knowledge and understanding only. The tired old technique of providing so-called "proof" is not going to work anymore, such as: Keep following the path of your ancestors blindly; and keep doing what they did in the name of religion to achieve salvation. The children of Adam are reaching their adult period of humanity. This is the reason that globally the grip of self-crafted religion is getting looser. This is a message of death for the religious priesthood. So, all their lamentations and cries are understandable. But the same thing is joyous news for the supporters of Allah's دین (*Deen*). The

downfall of religion is a sign of progress for دین (*Deen*); and demise of orthodoxy is a sign of truth's liveliness.

The flickering of stars is a sign of morning;
Sunrise in the horizon is end of dreaming!

The psychological state of fear on the faces of the custodians of religion; their unkempt hair and dirty getup; their shouting and becoming angry and restless at every step; their loss of composure – all these are signs that their disease is incurable; and they are amorously telling each other:

The reign of Almighty Allah is ipso facto;
Nnow there is no hope for cure of our ills!

On the other hand, the same thing is a sign of optimism and good news for the followers of دین (*Deen*), who, by looking at this scenario, conclude:

These setting of stars; this sad face of the moon;
The state tells the morn is bound to come soon!

My observation tells me that the world is about to enter the stage about which the Quran has said: يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (83:6) – The great revolution will occur in this way, and humankind will rise to establish the Divine order of universal sustenance. And: يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ۭ وَالْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ (82:19) – That will be the period when everyone will see his deeds in front of him. Neither will anyone be able to do anything for the other; nor would one have any authority over the other. All power and authority will rest with the Divine Laws; and only these laws will prevail. In other words, a human being will neither be subservient to any other, nor will he be needy. No one will be able to save any criminal from the punishment for his crime. This will be the period of دین (*Deen*).

This is the period whose arrival the Devil (Iblis) had sensed and told its agents (in the words of Iqbal):

The demand of modern times makes me really afraid;
That Prophet's life's role model may become revealed.
Beware! Hundred times beware of the Prophet's life's model;
It guards women's honor, drives man to lift up humanity.
Its message is death to those who want to enslave humanity;
There is no kingship is this system, nor the system of beggary.'
Its system purifies the wealth from every form of corruption;
It makes the rich the trustees of its people's wealth and welfare;
What could be a bigger revolution in thoughts and deeds?
That this Earth belongs to Allah, not to rulers and kings!

This was the fear about which Iblis was afraid of. So, he told his advisors to make sure:

That this divine idea remains hidden from world's eyes;
It is good that the believer himself is devoid of true belief.
It is better for him to remain lost in the maze of metaphysics;
That he forever be lost in the interpretation of the divine Book.

Then Iblis advised his agents:

The clarion call that once broke the riddles of our hegemony;
Make sure that the dark night of the God-conscious never ends.

To achieve these goals the Devil Iblis gave a program to his followers (the custodians of religion): to entangle people from their religious pulpits in abstract and trivial religious matters such as:

Is the son of Marry dead, or is he eternally alive?
Are the attributes separate from God, or they aren't?
Is the one who is supposed to come, is he Jesus?
Or, is he someone who will have Jesus's attributes?
Are the words of the Quran new, or are they ancient?
In which ideology is the salvation of the dead Ummah?
Aren't these enough for the Muslims of this period?
All these idols sculpted from the metaphysical world!

These custodians of religions are busy encircling their sculpted idols and the devil has commissioned his agents in full force to keep shooting tranquilizer darts filled with these subliminal messages at people so that they become totally unaware of the real actions of the real world. The devil tells his agents:

Make man stranger to the world of facts and deeds;
So that in playing field of life-action all his steps fail!
Make only that poetry and Sufism attractive for his life;
Which hide from his eyes the realm of actions of real life?

Despite all this brainwashing of the Ummah by his agents, the devil being still afraid of true believers he expressed his incessant fear thus:

But I fear in my every breath that this Ummah may become awake;
Because the reality of its دین (Deen) is accountability of entire Life!

So, he tells his agents:

Keep them busy reciting Allahu every morning;
Make them habituated to monastic way of living!

To Be continued....

4- وہ دائرہ اسلام سے باہر چوٹی کے حکماء اور فُضلاء کو ذہن میں رکھیں کیونکہ یہی لوگ ہیں جن کے قائل ہونے سے دنیا کی ذہنی فضا سے باطل تصورات کا اثر زائل کیا جاسکتا ہے۔

5- وہ علمی دنیا کے مسلمہ حقائق سے آغاز کر کے ان قرآنی حقائق کی طرف آئیں جن کی صحت لوگوں کے نزدیک مسلم نہیں۔

6- کسی غلط عقیدہ کی محض نفی مخالفین کو قائل نہیں کر سکتی جب تک اس کے مقابل کے صحیح تصور کا اثبات نہ کیا جائے۔

7- وہ ایک فلسفہ یا ایک فلسفیانہ خیال کی تردید کے لئے جن تصورات کو صحیح سمجھ کر کام میں لائیں تو کسی دوسرے فلسفہ یا فلسفیانہ خیال کی تردید کرتے ہوئے اسے غلط قرار نہ دیں۔ بلکہ اپنے موقف پر قائم رہیں۔

8- مغرب کے صحیح تصورات کو نہ تو رد کریں اور نہ ہی ان کے غلط تصورات کو قبول کریں۔

9- ہر غلط فلسفہ کے اندر وہ جن تصورات کو صحیح سمجھیں انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے غلط قرار نہ دیں اور جن تصورات کو غلط سمجھیں، انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے صحیح قرار نہ دیں ورنہ وہ اپنی تردید خود کریں گے۔

(3) ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کا موقف:

1- کسی علمی صداقت کے ساتھ متصادم نہ ہو بلکہ ہر زمانہ میں تمام علمی صداقتوں کے ساتھ پوری طرح سے ہم نوا اور ہم آہنگ رہے اور جوں جوں علمی صداقتیں منکشف ہوں وہ اس کے اندر سماتی چلی جائیں۔

2- جس کے تمام تصورات ایک دوسرے کے ساتھ عقلی ربط وضبط رکھتے ہوں اور ایک دوسرے کی عقلی تائید اور توثیق کرتے ہوں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہوسکتا ہے جب اس کے تمام تصورات قرآن کے بنیادی تصور کے ساتھ عقلی طور پر متعلق ہوں۔

3- جو تمام باطل فلسفوں کی موثر تردید کرتی ہو۔

4- جو کائنات کا ایک مکمل فلسفہ ہو اور حقیقتِ انسان و کائنات کے اہم مسائل کے بارے میں عملی راہ نمائی کرتی اور صداقت اور سچائی کا راستہ بتاتی ہو۔

5- جو علمی تصورات کی خامیوں کو آشکار کر کے انہیں پاکیزہ اور سُستہ بناتی ہو۔

6- جو ہمیں احکام دین کی حکمتوں اور علتوں کے پورے سلسلہ سے آگاہ کرتی ہو اور ان حکمتوں اور علتوں کا ایک ایسا تصور دیتی ہو، جس میں اندرونی طور پر کوئی تضاد نہ ہو۔

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL. 69
ISSUE
11

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com
Web:www.toluislam.com www.facebook.com/talueislam/



عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اُن کو اپنی منزل آسمانوں میں
نہ ہو نومید، نومیدی زوال علم و عرفاں ہے
اُمید مرد مومن ہے خدا کے راز دانوں میں
(علامہ محمد اقبالؒ)